ربیع الثانی ۱۴۴۶ھ
اکتوبر ۲۰۲۴ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیمِ اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

فتنۂ قادیانیت: زوال کا آغاز

بانیٔ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

ختم المرسلین، رحمۃ للعالمین، محمد مصطفیٰ ﷺ کی سیرتِ مطہرہ پر

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی کی جملہ کتب

سیرت النبی ﷺ سیریز

کے عنوان سے تین ضخیم جلدوں میں

سیرتُ النّبی ﷺ اور ہماری زندگی

(رسولِ اکرم ﷺ اور ہم)

سیرتُ النّبی ﷺ اور فلسفۂ انقلاب

(منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ)

خطباتِ سیرت النّبی ﷺ

(سیرتِ خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام)

❁ صفحات: 1100 ❁ معیاری کاغذ ❁ عمدہ طباعت ❁ دیدہ زیب ٹائٹل ❁ مضبوط جلد

ماہ ربیع الاوّل میں مکمل سیٹ

~~2500~~ روپے کے بجائے صرف **1200** روپے

فری ہوم ڈیلیوری کے ساتھ

مکتبہ خدام القرآن

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور: فون: 3-35869501(042)

واٹس ایپ نمبر: 0301-111-5348 maktaba@tanzeem.org

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد : 73

شمارہ : 10

ربیع الثانی 1446ھ

اکتوبر 2024ء

فی شمارہ : 50 روپے

سالانہ زرِتعاون: 500 روپے

مُدیر
حافظ عاکف سعید

مجلس ادارت:
ایوب بیگ مرزا، خورشید انجم

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

ادارتی معاون:
حافظ محمد زاہد، محمد خلیق

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700 ' فون: 3-35869501

ای میل: maktaba@tanzeem.org ' 0301-1115348

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321

publications@tanzeem.org

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: "دارُالاسلام" ملتان روڈ چوہنگ لاہور

(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-35473375(042)

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال — 5

سب ہوش کے ناخن لیں — خورشید انجم

بیانُ القُرآن — 9

التِّین + العَلق + القَدْر — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تذکرہ و تبصرہ — 23

فتنہ قادیانیت: زوال کا آغاز — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

حسنِ معاشرت — 37

☆ تربیت اولاد: باپ کا کردار — راحیل گوہر صدیقی

☆ گھر: ہماری دعوت کا اوّلین میدان — شعبہ تعلیم و تربیت — 47

انوارِ ھدایت — 53

انفاق فی سبیل اللہ — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

تذکیر و موعظت — 59

چند مہلک منکرات — حافظ محمد اسد

ظروف و احوال — 65

مسئلہ فلسطین: ایک طائرانہ نظر — ڈاکٹر ظفر الاسلام خان

خطوط و نکات — 74

ایک تصحیح۔ ایک وضاحت — ادارہ

دعوتِ فکر — 77

کیا ابتدائی دور کا انسان جنگلی تھا؟ — رضی الدین سید

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

سب ہوش کے ناخن لیں!

پاکستان تحریک انصاف کے بانی رہنما اکبر ایس بابر نے اپنے بیان میں انکشاف کیا ہے کہ ایک بین الاقوامی ایجنڈے کے تحت ایسی تمام سیاسی اور بظاہر قوم پرست قوتوں کو اکٹھا کیا جا رہا ہے جو پاکستان کی سالمیت اور قومی سلامتی کے اداروں کو کسی نہ کسی بہانے چیلنج کر رہی ہیں۔ کچھ مغربی ممالک کے سفارت کار اس سلسلے میں پوری طرح متحرک ہیں اور نجی محفلوں میں خیبر پختون خوا اور بلوچستان سے تعلق رکھنے والے تمام سیاست دانوں کو ایسی قوتوں کا ساتھ دینے کی ترغیب دے رہے ہیں جن کا مقصد ایک مشترکہ پلیٹ فارم تشکیل دے کر پاکستان کے وفاق کے خلاف شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات کی طرز پر مطالبات کرنا ہے۔ اکتوبر کے مہینے میں اس سلسلے میں اہم پیش رفت متوقع ہے۔ اکبر ایس بابر نے جس صورت حال کی طرف اشارہ کیا ہے اب وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے اور ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ رہی ہے اور ہر قلبِ حساس مضطرب ہے کہ انجامِ گلستان کیا ہوگا‘ دستورِ بہاراں کیا ہوگا! یہ سب ہماری اپنی نااہلی اور کوتاہی کا نتیجہ ہے۔ اغیار اور اعداء ایسی صورت حال کی تاک میں ہوتے ہیں بالکل اس کہاوت کی مانند کہ جب تندور گرم ہو تو اڑوس پڑوس کے لوگ روٹیاں پکانے آجاتے ہیں۔ چنانچہ کچھ عرصے سے وطن عزیز کے مختلف حصوں میں جو حالات اور واقعات رونما ہو رہے ہیں‘ اس نے ہر حساس شخص کی تشویش میں اضافہ کر دیا ہے۔ اس وقت ہر پاکستانی مسلمان خواہ امیر ہو یا غریب‘ پڑھا لکھا ہو یا اَن پڑھ‘ بڑا ہو یا چھوٹا‘ ملک وملت کے بارے میں شدید اندیشہ محسوس کر رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں صوبائیت اور لسانیت کا بیج تو اسی وقت ہی بو دیا گیا تھا جب ہمارا عزیز ملک معرضِ وجود میں آیا تھا۔ ابتدا ہی سے لسانی بنیادوں پر بنگالی عوام کی ناراضگی مول لے لی گئی۔ انہوں نے ۱۹۵۶ء کے آئین میں‘ جو پہلے ہی دیگر کئی وجوہات کی بنا پر التوا و تاخیر کا شکار تھا‘ اردو زبان کو قومی زبان تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ بعد میں ان کے مطالبہ کو تسلیم

کرتے ہوئے اردو کے ساتھ بنگالی کو بھی قومی زبان کا درجہ دے دیا گیا تھا‘ لیکن آپس میں اختلافات کی خلیج بڑھتی ہی چلی گئی اور بالآخر پاکستان دولخت ہو گیا۔ پاکستان کو یوں دو ٹکڑے ہوتے دیکھ کر بھی ہمارے سیاست دانوں اور مقتدر حلقوں نے سبق نہ سیکھا اور ملک کے دوسرے صوبوں میں بھی وقتاً فوقتاً صوبائیت اور لسانیت کو ہوا دی جاتی رہی۔ کبھی سندھو دیش کے نعرے لگے تو کبھی عظیم تر بلوچستان کا واویلا مچایا گیا‘ کبھی پختونستان کا راگ الاپا گیا اور کبھی مہاجر قوم کے نام پر انتشار پھیلایا گیا۔ صوبائیت پرستی نے ملک کو بہت نقصان پہنچایا‘ جس سے اغیار نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ بھارت نے علیحدگی پسندوں کو ہر طرح کا تعاون فراہم کیا اور انہیں مالی فوائد کا لالچ دے کر پاکستان کے خلاف اکسایا۔ امریکہ اور بھارت نے پاکستان کو توڑنے کی بھرپور کوششیں کی جو آج تک جاری ہیں۔ ’’را‘‘ کے جتنے بھی جاسوس پکڑے گئے‘ وہ دور دراز اور سہولیات سے محروم علاقوں میں تخریب کاری میں ملوث پائے گئے‘ جس کا اعتراف انہوں نے خود کیا۔ کلبھوشن یادیو اور اُس کا نیٹ ورک اس کی تازہ ترین مثال ہے۔

ابھی حال ہی میں بلوچستان میں رونما ہونے والے واقعات نے ہر شخص کو ایک مرتبہ پھر ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اگرچہ بلوچستان میں ماضی میں بھی متعدد بار ہمارے سیاست دانوں کی عاقبت نااندیشی اور ذاتی مفادات کی بنا پر بے چینی پیدا ہوئی‘ یہاں تک کہ بغاوت کی سی صورت بھی ظاہر ہوئی جس کو فرو کرنے کے لیے طاقت کا استعمال کیا گیا‘ لیکن حال ہی میں اکبر بگٹی کی برسی کے موقع پر جس طرح بسوں سے اتار کر اور شناختی کارڈ چیک کر کے پنجاب کے لوگوں کو قتل کیا گیا‘ اس سے پنجاب کے بارے میں نفرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسی موقع پر بلوچستان کا پاکستان سے زمینی راستہ بھی کاٹ دیا گیا۔ بموں کے دھماکے اور دوسری تخریبی سرگرمیاں اب معمول بن چکی ہیں۔ ڈاکٹر ماہ رنگ بلوچ کے جلسے واقعتاً ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کا نقشہ پیش کر رہے ہیں۔ علاوہ ازیں مسنگ پرسنز (لاپتہ افراد) کے حوالے سے بلوچستان کے دھرنے اب ایک تحریک کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ دوسری جانب خیبر پختونخوا کا صوبہ ہے‘ جس کی بدامنی پچاس برس سے جاری ہے۔ گویا نصف صدی کا قصہ ہے‘ دو چار برس کی بات نہیں۔ صد افسوس کہ یہ نصف صدی بم دھماکوں اور تخریبی سرگرمیوں سے عبارت ہے‘ اگرچہ کچھ عرصہ گویا سانس لینے کے لیے کچھ کمی آ جاتی ہے‘ یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر۔ اب تو پولیس بھی ریاستی اداروں کے بالمقابل کھڑی ہو گئی ہے اور تقریباً چار اضلاع میں ہڑتال پر چلی گئی ہے۔

سندھ بظاہر تو پُرسکون نظر آ رہا ہے لیکن سندھی نیشنل ازم کا پودا بھی ایک تناور درخت بن چکا ہے جس کے خمیر میں دین بیزاری اور مذہب بیزاری کا عنصر بھی شامل ہے۔ بہرحال تین نسلوں پر الحاد و ارتداد کی محنت و کوشش کا نتیجہ یہ ہے کہ سندھ کا نوجوان اور خاص کر تعلیم یافتہ طبقہ کا ایک بہت بڑا حصہ دین و مذہب سے بیزار ہو کر الحاد و دہریت کی گود میں چلا گیا ہے۔

پنجاب جو آبادی کے لحاظ سے پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے' کہنے کو تو یہ سب سے خوش حال صوبہ ہے جو دوسرے صوبوں کے نزدیک ان کے استحصال کا نتیجہ ہے۔ پھر یہ کہ سول وملٹری بیوروکریسی کی اکثریت کا تعلق پنجاب سے ہے اور یہ عدم توازن بھی دوسرے صوبوں کو پنجاب کے خلاف بھڑکانے کا ایک سبب ہے۔ دوسری طرف خود پنجاب میں بھی امن و امان کی صورت حال انتہائی مخدوش ہے اور کچے کے ڈاکوؤں نے پنجاب کے سکیورٹی اداروں کی پیشہ وارانہ استعداد کی قلعی کھول دی ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ کچے کے ڈاکوؤں کا پکے کے ڈاکوؤں کے ساتھ جنٹلمین ایگریمنٹ (شریفانہ معاہدہ) ہے۔

اس پر مستزاد حکومت اور ریاستی اداروں کا اپوزیشن کے ساتھ جابرانہ طرزِ عمل ہے۔ پاکستان کی ہر سیاسی جماعت کو آئین اور قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے جلسوں کے انعقاد اور پُرامن احتجاج کا حق حاصل ہے لیکن پہلے جلسے کو روکنا' اجازت کے بعد اس میں رکاوٹیں ڈالنا اور پھر اراکینِ پارلیمنٹ کو ایوان سے گرفتار کرنا بھی انتہائی تشویش ناک ہے۔ یہ ایک ایسی غلط روایت ہے جس سے فسطائیت کی بُو آتی ہے۔

ملک کے تمام سیاست دانوں اور مقتدر حلقوں سے ہماری دست بستہ گزارش ہے کہ سب ہوش کے ناخن لیں اور ماضی کے تلخ تجربات سے سبق حاصل کریں۔ ایسی تمام سرگرمیوں اور کارروائیوں سے گریز کریں جن سے عوام ملک کے دیگر صوبوں اور علاقوں کے خلاف بھڑک اٹھیں۔ اس نازک وقت میں تمام سیاست دان اور مقتدر طبقات ملک کی خاطر اپنے اختلافات بھلا کر اکٹھے بیٹھ کر ایک لائحۂ عمل طے کریں کہ ملکی سالمیت کو کس طرح محفوظ بنایا جا سکتا ہے۔ وفاقی حکومت کا فرض ہے کہ وہ ملک کے دور دراز علاقوں کو احساس محرومی سے نکالنے کے لیے انہیں دیگر علاقوں کی طرح سہولیات فراہم کرے۔ ان علاقوں میں تعلیم' علاج اور روزگار کا مناسب انتظام کیا جائے۔ قدرتی وسائل میں ان کو پورا پورا حق دیا جائے۔ ان علاقوں میں

صنعتیں قائم کی جائیں تاکہ لوگوں کو روزگار ملے اور ان کا معیارِ زندگی بہتر ہو۔ یوں صوبائیت پرستی کا خاتمہ ممکن ہوگا اور ملک دشمن عناصر کو بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

یہاں جملہ معترضہ کے طور پر یہ بھی عرض کیے دیتے ہیں کہ اگر چھوٹے چھوٹے صوبے بنا دیے جائیں یا ہر ڈویژن کو ایک صوبہ کا درجہ دے دیا جائے تو نہ صرف یہ انتظامی لحاظ سے زیادہ بہتر ہوگا بلکہ اس سے قوم پرستی اور صوبائی عصبیت کا خاتمہ کرنے میں بھی مدد ملے گی۔ دنیا بھر میں انتظامی بنیادوں پر صوبے بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔ یعنی اگر حکومت یہ محسوس کرے کہ کوئی صوبہ آبادی یا رقبے کے لحاظ سے بہت بڑا ہے اور انتظامیہ کے لیے اس کی دیکھ بھال مشکل ہو رہی ہے تو پھر کسی بھی صوبے کی تقسیم اور نئے صوبوں کی بنیاد رکھنے میں کوئی قباحت نہیں ہونی چاہیے۔ ضرورت کے مطابق ایسا کرنا فائدہ مند ہوتا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی کسی نے اپنے نظریات لوگوں پر مسلّط کرنے کی کوشش کی تو مسائل نے جنم لیا اور کاروبارِ دنیا الجھتا گیا۔ خطۂ زمین پر بسنے والے نہ صرف گروہوں میں بٹے بلکہ رنگ، نسل اور زبان کی بنیاد پر تقسیم ہو کر رہ گئے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل کیا گیا اللہ تعالیٰ کا یہ آخری اور حتمی کلام غالب ہونے کے لیے ہی آیا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ اس آئین پر ہی عمل کرتے ہوئے دنیا میں ایک ایسی حکومت قائم کی جا سکتی ہے جس میں رنگ و نسل اور لسانی بنیادوں پر انسانیت کی تقسیم نہ ہو بلکہ عدل ہو۔ وہ حکومت قائم ہو جس کا حاکم عوام کے سامنے جواب دہ ہو اور اُن کا مسیحا ہو، جس مملکت میں لوگ تعلیم سے محروم نہ ہوں۔ ایسا معاشرہ وجود میں آئے جہاں زکوٰۃ دینے والے تو ہوں مگر لینے والے نہ ہوں۔ ایسا معاشرہ قائم ہو جس میں طاقت ور کمزور پر ظلم نہ کر سکے۔ ایسے نظامِ حکومت کو دنیا نے خلافتِ راشدہ کے دور میں اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھا اور پرائے بھی اس کی برکتوں کے معترف ہوئے۔ لہٰذا مملکتِ خداداد پاکستان جو اسلام کے نام پر وجود میں آئی تھی، اس کے جملہ مسائل کا حل صرف یہی ہے کہ ہم اپنی اصل کی طرف لوٹیں اور ملک کو صحیح معنوں میں ایک اسلامی فلاحی ریاست بنائیں۔ اس راستے کا انتخاب کیا جائے جس پر چل کر دنیا اور آخرت میں سرخرو ہوا جا سکے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ تمام صاحبانِ حل وعقد اور فیصلہ کی مسند پر بیٹھے تمام افراد کو ہدایت عطا فرمائے اور ملک و قوم کے حوالے سے صحیح فیصلے کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! ۞ ۞ ۞

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُوْرَۃُ التِّیْنِ

تمہیدی کلمات

سورۃ التین میں انسانی زندگی کے نفسیاتی اور فلسفیانہ پہلو سے متعلق اہم حقائق بیان ہوئے ہیں۔ بنیادی طور پر اس سورت کا مضمون چونکہ انسان کی تخلیق سے متعلق ہے اس لیے اسے سمجھنے کے لیے نفسِ انسانی کی تخلیق کے بارے میں سورۃ الشّمس کی آیت ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸﴾ کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسانی نفس کے بارے میں یہ حقیقت واضح فرمادی ہے کہ اس میں نیکی اور بدی کی تمیز الہام کردی گئی ہے۔ اب اس حقیقت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے آپ ایک ایسے انسان کا تصوّر کریں جس کی اخلاقی حس پوری طرح فعال و بیدار ہے۔ ایسا انسان جب ایک بگڑے ہوئے معاشرے کو دیکھتا ہے (بدقسمتی سے آج ہمارا معاشرہ اجتماعی بگاڑ کا مثالی نقشہ پیش کرتا ہے) تو وہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ شاید انسان بنیادی طور پر بہت گھٹیا اور گندی مخلوق ہے اور یہ کہ شاید اس میں خیر نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ اسی وجہ سے دورِ جدید کے تقریباً تمام ماہرینِ نفسیات اس نکتے پر متفق ہیں کہ انسان کے اندر حیوانی داعیات یعنی پیٹ اور شہوت کے تقاضوں اور حُبِّ تفوق (urge to dominate) کے علاوہ اور کوئی حس یا داعیہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ یہ صورتِ حال ایک حساس انسان کے لیے یقیناً بہت مایوس کن ہے۔ لیکن اس کے برعکس یہ سورت ہمیں اس حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ انسان صرف شر کا پتلا اور گناہ کی پوٹلی ہی نہیں ہے بلکہ اس میں بہت اعلیٰ بلندیوں کو چھونے کی صلاحیت بھی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

وَالتِّيْنِ وَ الزَّيْتُوْنِ ۝۱ وَ طُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝۲ وَ هٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝۳ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝۴ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ

اَسۡفَلَ سٰفِلِیۡنَ ۙ﴿۵﴾ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ؕ﴿۶﴾ فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعۡدُ بِالدِّیۡنِ ؕ﴿۷﴾ اَلَیۡسَ اللّٰهُ بِاَحۡکَمِ الۡحٰکِمِیۡنَ ﴿۸﴾

آیت ۱ ﴿وَالتِّیۡنِ وَالزَّیۡتُوۡنِ ۙ﴿۱﴾﴾ ''گواہ ہے انجیر اور گواہ ہے زیتون۔''

آیت ۲ ﴿وَطُوۡرِ سِیۡنِیۡنَ ۙ﴿۲﴾﴾ ''اور گواہ ہے طورِ سینا۔''

آیت ۳ ﴿وَهٰذَا الۡبَلَدِ الۡاَمِیۡنِ ۙ﴿۳﴾﴾ ''اور گواہ ہے یہ امن والا شہر۔''

التِّین کے معنی انجیر کے ہیں اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قومِ نوحؑ کے علاقے میں ایک بڑے پہاڑ کا نام بھی جبل التِین تھا اور یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اسی پہاڑ کے دامن میں ساڑھے نو سو سال تک دعوت و تبلیغ کے فرائض سرانجام دیے۔ اسی طرح الزَّیْتُون سے مراد زیتون کا پھل اور درخت بھی ہے اور وہ پہاڑی بھی جس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اکثر تبلیغی خطبات دیا کرتے تھے۔ ان خطبات میں سے آپؑ کا ایک خطبہ ''پہاڑی کے وعظ'' (Sermon of the Mount) کے نام سے خاص طور پر مشہور ہے۔ تیسری قسم (وَطُوْرِ سِیْنِیْنَ) کا تعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذات سے ہے۔ کوہِ طور پر آپؑ کو اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوا۔ اور امن والے شہر سے مکّہ مکرمہ مراد ہے جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سورت کے نزول کے وقت دعوت و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔

گویا ان آیات میں جن مقامات کی قسمیں کھائی گئی ہیں ان میں سے ہر مقام کا تعلق ایک جلیل القدر شخصیت سے ہے۔ گویا ان شخصیات کو گواہ بنا کر یہاں اس حقیقت کی طرف توجّہ دلانا مقصود ہے کہ بنیادی طور پر انسان بہت بلند مرتبت اور صاحبِ عزّت و عظمت مخلوق ہے۔ اگر کسی کو اس حقیقت کے بارے میں کوئی شک ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کے بندے نوح علیہ السلام کی زندگی کے شب و روز کا تصوّر کرے۔ اُس کے بندے عیسیٰ علیہ السلام کے کردار کا نقشہ ذہن میں لائے، موسیٰ علیہ السلام کی عظیم المرتبت شخصیت کو یاد کرے اور پھر سب سے بڑھ کر اُس کے بندے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے مثال سیرت کا نمونہ دیکھے۔ یہ شخصیات، ان کے کردار اور ان کی سیرتیں اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ:

آیت ۴ ﴿لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ ۖ﴿۴﴾﴾ ''ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔''

ہم نے تو انسان کو اشرف المخلوقات کے اعلیٰ مرتبے پر فائز کیا تھا: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰي كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝﴾ (بنی اسراء یل) ''اور ہم نے بڑی عزّت بخشی ہے اولادِ آدمؑ کو اور ہم اٹھائے پھرتے ہیں انہیں خشکی اور سمندر میں اور ہم نے انہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق عطا کیا اور انہیں فضیلت دی اپنی بہت سی مخلوق پر بہت بڑی فضیلت''۔ نسلِ انسانی کی عزّت وتکریم کی انتہا یہ ہے کہ ان کے جدِ امجد کو ہم نے اپنے دونوں ہاتھوں سے تخلیق کیا (صٓ: ۷۵) اور مسجودِ ملائک بنایا۔

اگر تمہیں یہ دنیا ظالموں، بدکاروں اور گھٹیا انسانوں سے بھری نظر آتی ہے تو اللہ نے بھی تمہارے سامنے اپنے ایسے چار بندوں کی مثالیں پیش کر دی ہیں جو عظمتِ انسانی کے زندہ وجاوید ثبوت ہیں۔ کیا ان مثالوں کو دیکھنے کے بعد بھی کوئی عقل کا اندھا یہ دعویٰ کرے گا کہ انسان کے اندر خیر اور عظمت کا کوئی پہلو سرے سے موجود ہی نہیں؟ بہرحال اگر کوئی شخص عظمت کے ان میناروں کو دیکھ لینے کے بعد بھی انسانی عظمت کا قائل نہ ہو اور اس عظمت واکرام کو پانے کے لیے اپنا رخ تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرے تو یقیناً اس کا شمار نسلِ انسانی کے ان افراد میں ہوگا جو شرفِ انسانیت سے نیچے گر کر حیوانوں سے بھی بدتر ہو چکے ہیں: ﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ط﴾ (الاعراف: ۱۷۹)

آیت ۵ ﴿ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝﴾ ''پھر ہم نے لوٹا دیا اس کو پست ترین حالت کی طرف۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی اس عظیم المرتبت مخلوق (کی روح) کو اس کے جسدِ خاکی میں بٹھا کر نیچے دنیا میں بھیج دیا۔ لیکن واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر جہالت کی تاریکی میں نہیں بلکہ ہدایت کے اُجالے میں بھیجا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے کامیابی اور ناکامی کے راستوں کا شعور بھی عطا کیا، اس کی فطرت میں نیکی وبدی کی تمیز بھی ودیعت کی اور وقتاً فوقتاً وہ براہِ راست ہدایات بھی بھیجتا رہا: ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ط﴾ (الحشر: ۱۹) کہ تم اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کو فراموش کر دیا اور اس کی پاداش میں اللہ نے انہیں اپنے آپ سے ہی غافل کر دیا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اب اگر وہ اپنے شرفِ انسانی کو بھلا کر محض حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتا رہے اور خود کو حیوان ہی سمجھتا رہے

تو یہ اس کی مرضی ہے۔

اس فلسفے کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنی سرشت (حیوانی وجود کے تقاضوں) کے اعتبار سے انسان میں کچھ کمزوریاں اور خامیاں پائی جاتی ہیں' لیکن اپنی فطرت (روح) کے لحاظ سے یہ بہت اعلیٰ اور عظیم المرتبت مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی روح کو اس کے حیوانی جسم میں متمکّن فرما کر اسے دنیا میں بھیجا تو اس کا ارفع و اعلیٰ روحانی وجود اس کے حیوانی جسم میں قید ہو کر گویا اسفل (نچلی) مخلوق کی سطح پر آ گیا۔ چنانچہ دنیوی زندگی میں اس کے سامنے اصل ہدف یہ ہے کہ وہ اپنے شعور اور اللہ تعالیٰ کی فراہم کردہ ہدایت کے مطابق راستہ اختیار کرے' اس راستے کے تقاضے پورے کرنے کے لیے محنت کرے اور اسفل سطح سے اوپر اٹھ کر اپنی اصل عظمت اور حقیقی منزل کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

اب اگلی آیت میں اس راستے کی نشاندہی اور مطلوبہ محنت کے طریقے کی وضاحت کی گئی ہے:

آیت ۶ ﴿اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ''سوائے اُن لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے''

اب مذکورہ پستی سے صرف وہی لوگ نکل پائیں گے جو اپنے شعور و حواس سے کام لیتے ہوئے اپنے خالق اور معبود کو پہچانیں گے یعنی اُس پر ایمان لائیں گے اور پھر محنت کر کے اپنے کردار و عمل کو اُس کی منشاء و مرضی کے مطابق ڈھالیں گے' یعنی اعمالِ صالحہ کا اہتمام کریں گے۔

﴿فَلَهُمۡ اَجۡرٌ غَيۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ۝۶﴾ ''تو اُن کے لیے ایسا اجر ہوگا جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوگا۔''

آیت ۷ ﴿فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعۡدُ بِالدِّيۡنِ ۝۷﴾ ''تو اس کے بعد کیا چیز تجھے آمادہ کرتی ہے جزا و سزا کے انکار پر؟''

تو اے جزا و سزا کے منکر انسان! جب تُو خود دیکھ رہا ہے کہ دنیا میں تمام انسان ایک جیسے نہیں ہیں' ان میں کچھ بہت اعلیٰ سیرت و کردار کے مالک ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو انسانیت کے ماتھے پر بدنما داغ کی حیثیت رکھتے ہیں' تو اس صورت حال میں کیا عقل اور انصاف کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ اچھوں کو اُن کی اچھائی اور محنت کا پھل ملے اور بُروں کو اُن کی بُرائی اور نافرمانی کی سزا دی جائے؟ یہ ایسی سیدھی سادی بات ہے جو عام ذہنی سطح کا ایک انسان بھی سمجھ سکتا ہے۔ تو یہ سب کچھ

دیکھنے، سننے اور سمجھنے کے بعد بھی آخر وہ کون سی منطق ہے جس کے تحت تم جزا و سزا کے انکار پر جمے ہوئے ہو؟

آیت ۸ ﴿اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِاَحۡکَمِ الۡحٰکِمِیۡنَ ۸﴾ ’’کیا اللہ تمام حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟‘‘

دنیا میں تم لوگ چھوٹے چھوٹے حاکموں کو دیکھتے ہو کہ وہ اپنے غداروں اور باغیوں کو عبرتناک سزا دیتے ہیں اور اپنے وفاداروں کو انعام و اکرام سے نوازتے ہیں۔ کیا دنیا میں تم نے کوئی ایسا حاکم بھی دیکھا ہے جو اپنے باغیوں اور وفاداروں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دے؟ اگر دنیا میں محدود اختیار کا مالک کوئی حاکم ایسا نہیں کرتا تو وہ اللہ عزّوجل اپنے فرمانبردار بندوں اور نافرمانوں کو کیسے برابر کر دے گا جو سب حاکموں سے بڑا حاکم ہے؟ کیا تم اللہ تعالیٰ کو احکم الحاکمین نہیں مانتے ہو؟

مسند احمد، سنن الترمذی، سنن ابی داؤد اور دیگر کُتبِ حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی سورۃ التین پڑھے اور اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِاَحۡکَمِ الۡحٰکِمِیۡنَ پر پہنچے تو کہے: بلٰی وانا علٰی ذٰلک من الشاھدین ’’کیوں نہیں! اور مَیں اس پر شہادت دینے والوں میں سے ہوں‘‘۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب یہ آیت پڑھتے تو فرماتے: سُبۡحَانَکَ فَبَلٰی! ❁❁

سُوۡرَۃُ الۡعَلَقِ

تمہیدی کلمات

سورۃ العلق کی ابتدائی پانچ آیات کے بارے میں تمام مفسّرین متفق ہیں کہ غارِ حرا میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر جو پہلی وحی آئی تھی وہ ان آیات پر مشتمل تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر وحی کی ابتدا سچّے خوابوں سے ہوئی۔ رات کو آپؐ جو خواب دیکھتے، دن کو اس کی تعبیر ہو بہو وہی سامنے آ جاتی۔ پھر آپؐ خلوت گزینی کی طرف مائل ہو گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب آپؐ کئی کئی راتوں تک غارِ حرا میں قیام فرمایا کرتے تھے۔ آپؐ

فرماتی ہیں: فَیَتَحَنَّثُ فِیْہِ یعنی غارِ حرا میں آپؐ عبادت کیا کرتے تھے۔ غارِ حرا کی خلوت میں آپ ﷺ کی عبادت کی نوعیت کیا تھی‘ اس بارے میں تمام شارحین حدیث کا اجماع ہے کہ وہاں پر آپؐ اپنا وقت غور وفکر اور سوچ بچار (التفکر والاعتبار) میں گزارتے تھے۔ اسی زمانے میں ایک دن آپ ﷺ غارِ حرا میں مصروفِ ذکر وفکر تھے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور آپؐ سے کہا: اِقْرَاْ کہ پڑھیے۔ آپؐ نے فرمایا: مَا اَنَا بِقَارِئٍ کہ مَیں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ اس پر حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپ ﷺ کو سینے سے لگا کر بھینچا اور پھر پڑھنے کو کہا۔ آپؐ نے پھر فرمایا: مَا اَنَا بِقَارِئٍ۔ حضرت جبرائیلؑ نے پھر وہی عمل دہرایا اور آپ ﷺ نے پھر وہی جواب دیا۔ حتیٰ کہ جب حضرت جبرائیلؑ نے تیسری مرتبہ آپؐ کو بھینچنے کے بعد فرمایا: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ① ...الخ﴾ تو مذکورہ آیات آپ ﷺ کی زبانِ مبارک پر جاری ہو گئیں۔ اس حوالے سے مجھے اس روایت سے اتفاق ہے کہ اس وحی کے نزول کے وقت حضرت جبرائیل علیہ السلام آپؐ کے پاس سونے کی ایک تختی لے کر آئے تھے جس پر یہ آیات لکھی ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے اگر حضرت جبرائیلؑ نے آپؐ کو زبانی پڑھانا ہوتا تو آپؐ یقیناً مذکورہ جواب نہ دیتے۔ یعنی ضرور آپؐ کے سامنے کوئی ایسی چیز آئی تھی جسے دیکھ کر پڑھنا تھا۔ تبھی آپ ﷺ نے فرمایا: مَا اَنَا بِقَارِئٍ۔

اس وحی کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اس موقع پر حضرت جبرائیل علیہ السلام آپ ﷺ کے پاس اپنی اصلی مَلَکی شکل میں آئے تھے۔ اُس وقت اگرچہ آپ ﷺ نیم بیداری اور نیم خوابیدگی کی کیفیت میں تھے‘ لیکن آپؐ نے حضرت جبرائیل کو ان کی اصلی شکل میں دیکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب ایک طویل وقفے (فترتِ وحی) کے بعد چوتھی وحی کے نزول کے موقع پر حضرت جبرائیلؑ آپؐ کو اُفق پر نظر آئے (اس واقعہ کی تفصیل سورۃ المدثر کے تمہیدی کلمات میں بیان ہو چکی ہے) تو آپ ﷺ نے انہیں دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ وہی فرشتہ ہے جو قبل ازیں میرے پاس غارِ حرا میں آیا تھا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ① خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ②

اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ﴿۳﴾ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ﴿۴﴾ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ
مَالَمْ یَعْلَمْ ؕ﴿۵﴾ كَلَّاۤ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰۤی ۙ﴿۶﴾ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰی ؕ﴿۷﴾ اِنَّ
اِلٰی رَبِّكَ الرُّجْعٰی ؕ﴿۸﴾ اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْهٰی ۙ﴿۹﴾ عَبْدًا اِذَا صَلّٰی ؕ﴿۱۰﴾
اَرَءَیْتَ اِنْ كَانَ عَلَی الْهُدٰۤی ۙ﴿۱۱﴾ اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰی ؕ﴿۱۲﴾ اَرَءَیْتَ
اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰی ؕ﴿۱۳﴾ اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ یَرٰی ؕ﴿۱۴﴾ كَلَّا لَىِٕنْ لَّمْ
یَنْتَهِ ۬ۙ لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِیَةِ ۙ﴿۱۵﴾ نَاصِیَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ۚ﴿۱۶﴾ فَلْیَدْعُ
نَادِیَهٗ ۙ﴿۱۷﴾ سَنَدْعُ الزَّبَانِیَةَ ۙ﴿۱۸﴾ كَلَّا ؕ لَا تُطِعْهُ وَ اسْجُدْ وَ
اقْتَرِبْ ۩﴿۱۹﴾

آیت ۱ ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾﴾ ''پڑھیے اپنے اُس رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔''

آیت ۲ ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ﴿۲﴾﴾ ''انسان کو پیدا کیا ہے اُس جونک کی طرح کی چیز سے جو رحمِ مادر میں چمٹ گئی تھی۔''

آیت ۳ ﴿اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ﴿۳﴾﴾ ''پڑھیے اور آپؐ کا ربّ بہت کریم ہے۔''

آیت ۴ ﴿الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ﴿۴﴾﴾ ''جس نے تعلیم دی ہے قلم کے ساتھ۔''

گویا عام انسانی تعلیم کا ذریعہ قلم ہے، جبکہ حضور ﷺ کی تعلیم کے لیے فرشتہ مقرر ہوا۔

آیت ۵ ﴿عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ ؕ﴿۵﴾﴾ ''اور انسان کو وہ کچھ سکھایا ہے جو وہ نہیں جانتا تھا۔''

پہلی وحی ان پانچ آیات پر مشتمل تھی۔ اس وحی میں حضور ﷺ کو تبلیغ و انذار سے متعلق کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ البتہ اس وحی کی خاص اہمیت یہ ہے کہ اس سے آپؐ کی نبوت کا ظہور ہوا (ہر نبی اگرچہ پیدائشی طور پر ہی نبی ہوتا ہے لیکن اس کی نبوت کا باقاعدہ ظہور پہلی وحی کے وقت ہوتا ہے)۔ تبلیغ کا باقاعدہ حکم آپؐ کو سورۃ المدثر کی ان آیات میں دیا گیا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾ قُمْ فَاَنْذِرْ ۪ۙ﴿۲﴾ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۪ۙ﴿۳﴾﴾ کہ اے لحاف میں لپٹ کر لیٹنے والے (ﷺ) کھڑے ہو جاؤ اور اپنے رب کی کبریائی کا اعلان کرو۔ یعنی اے نبی (ﷺ) اب آپ اللہ تعالیٰ کی کبریائی کو

عملی طور پر نافذ کرنے کے لیے جِدّ و جُہد شروع کر دیجیے۔ سورۃ العلق اور سورۃ المدثر کے مابین اس لحاظ سے گہری مشابہت پائی جاتی ہے کہ سورۃ المدثر کی طرح یہ سورت بھی تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پھر جس طرح سورۃ المدثر کی پہلی سات آیات میں حضور ﷺ سے خطاب کے بعد تین آیات میں قیامت کا ذکر آیا ہے، بالکل اسی طرح اس سورت میں بھی پہلی پانچ آیات میں حضور ﷺ سے خطاب ہے اور اس کے بعد درج ذیل تین آیات میں آخرت کا فلسفہ بیان ہوا ہے۔

آیت ۶ ﴿كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝۶﴾ ’’کوئی نہیں! انسان سرکشی پر آمادہ ہو ہی جاتا ہے۔‘‘

انسان سرکشی اور ظلم و زیادتی پر کیوں اُتر آتا ہے؟ اس کی وجہ اگلی آیت میں بتائی گئی:

آیت ۷ ﴿اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝۷﴾ ’’اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو مستغنی دیکھتا ہے۔‘‘

وہ دیکھتا ہے کہ اس پر کوئی پکڑ نہیں۔ دنیا میں نہ تو ظالم کو اُس کے ظلم کی قرار واقعی سزا ملتی ہے اور نہ ہی مظلوم کی کما حقہ دادرسی ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس دنیا کا نظام محض طبعی قوانین و ضوابط (physical laws) کے مطابق چل رہا ہے اور یہ کہ یہاں اخلاقی قوانین (moral laws) کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ انسان کی روزمرہ زندگی کا تجربہ بھی اُسے یہی بتاتا ہے کہ زہر کھانے سے تو آدمی ہلاک ہو جاتا ہے لیکن حرام کھانے سے اُسے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ چنانچہ جب معاشرے کے عام آدمی کو نیکی، انصاف، دیانت داری جیسے الفاظ عملی طور پر بے معنی اور بے وقعت نظر آتے ہیں تو وہ سرکشی اور مَن مرضی کے راستے پر چل نکلتا ہے —— اب اگلی آیت میں انسان کی اس سرکشی اور بغاوت کا علاج بتایا جا رہا ہے۔ اس کا علاج اس یاد دہانی میں ہے کہ:

آیت ۸ ﴿اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۝۸﴾ ’’یقیناً تجھے اپنے رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔‘‘

گویا انسان کو راہِ راست پر رکھنے کا جو مؤثر ترین علاج ہے وہ ہے عقیدۂ آخرت پر پختہ یقین۔ یعنی یہ یقین کہ ایک دن اُسے اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش ہو کر اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہے اور وہ عدالت بھی ایسی ہے جہاں ذرّہ برابر بھی کوئی چیز چھپائی نہیں جا سکے گی:

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝۷ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝۸﴾

(الزلزال) ''جس کسی نے ذرّے کے ہم وزن نیکی کمائی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا۔ اور جس کسی نے ذرّے کے ہم وزن برائی کی ہوگی وہ بھی اسے دیکھ لے گا''۔ گویا یہ عقیدۂ آخرت پر پختہ یقین اور قیامت کے دن کی پیشی کا خوف ہی ہے جو انسان کے اندر خود احتسابی کا احساس اُجاگر کرتا ہے۔ یہی یقین اور خوف اسے خلوت وجلوت میں‘ اندھیرے اُجالے میں اور ہر جگہ‘ ہر حال میں غلط روی اور ظلم وتعدّی کے ارتکاب سے باز رکھتا ہے۔ ورنہ انسان کی سرشت ایسی ہے کہ جس مفاد تک اس کا ہاتھ پہنچتا ہوا سے سمیٹنے کے لیے وہ حلال وحرام اور جائز وناجائز کی حدود کی پروا نہیں کرتا۔

اب اگلی آیت سے اس سورت کا تیسرا حصّہ شروع ہو رہا ہے۔ سورۃ المدثر کے ساتھ اس سورت کے مضامین کی مشابہت کا انداز ملاحظہ ہو کہ سورۃ المدثر کے تیسرے حصّے میں ولید بن مغیرہ کے کردار کی جھلک دکھائی گئی ہے‘ جبکہ یہاں اس کے مقابل ابوجہل کے طرزِ عمل کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

آیت ۹ ﴿اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ۝۹﴾ ''کیا تم نے دیکھا اُس شخص کو جو روکتا ہے۔''

آیت ۱۰ ﴿عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ۝۱۰﴾ ''(ہمارے) ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے۔''

یہ اشارہ ہے ابوجہل کی ان جسارت آمیز حرکات کی طرف جو وہ حضور ﷺ کو نماز سے روکنے کے لیے کیا کرتا تھا۔ مثلاً ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ ابوجہل نے آپؐ کو دیکھا تو اونٹ کی اوجھڑی منگوا کر عین سجدے کی حالت میں آپؐ کی پشت مبارک پر رکھوا دی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ابھی بچی تھیں‘ ان کو پتا چلا تو آپؓ گھر سے بھاگم بھاگ حرم میں پہنچیں اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس غلاظت کو آپؐ کے اوپر سے ہٹایا۔ اسی طرح ایک اور موقع پر ابوجہل نے آپ ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھ کر آپؐ کی گردن مبارک میں چادر ڈال کر اس قدر زور سے مروڑا کہ آپؐ کی آنکھیں اُبل پڑیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ حضور ﷺ کے سفرِ طائف سے واپسی کے زمانے میں بھی پیش آیا۔ اس واقعہ کی تفصیل روایات میں یوں آتی ہے کہ ابوجہل نے لات اور عزیٰ کی قسم کھا کر کہا تھا کہ اگر اس نے پھر محمد (ﷺ) کو اس طرح نماز پڑھتے دیکھا تو اُن کی گردن روند ڈالوں گا اور اُن کا منہ خاک آلود کر دوں گا۔ ایک دن اُس نے آپ ﷺ کو حرم میں نماز پڑھتے دیکھا تو غصے میں آپؐ کو ڈانٹتے ہوئے آپؐ کی طرف بڑھا تاکہ اپنی قسم پوری کرے‘ مگر پھر یکدم دہشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔ لوگوں نے پوچھا کیا

ہوا؟ کیوں پیچھے ہٹ آئے؟ کہنے لگا کہ آگے بڑھنے پر مجھے اپنے اور محمد (ﷺ) کے درمیان حائل آگ سے بھری ہوئی ایک خندق اور ایک پروں والی کوئی مخلوق دکھائی دی جو میری تکّہ بوٹی کرنے کو تیار تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر وہ میرے قریب پھٹکتا تو فرشتے اس کے چیتھڑے اڑا دیتے۔ یہاں یہ نکتہ لائق توجّہ ہے کہ پہلے دونوں واقعات کے حوالے سے ابوجہل کو ایسے کسی غیر معمولی یا غیر مرئی ردِّعمل کا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ میرے نزدیک اس کی توجیہہ یہ ہے کہ پہلے دونوں واقعات کے زمانے میں حضور ﷺ کی پشت پناہی کے لیے دنیوی اسباب کے طور پر جناب ابوطالب موجود تھے‘ جبکہ تیسرا واقعہ اس زمانے میں پیش آیا جب یہ دنیوی سہارا ابھی موجود نہ رہا اور اب حضور ﷺ کی حفاظت براہِ راست اللہ تعالیٰ خود فرما رہا تھا۔ اس لیے اس وقت غیبی مدد کے ذریعے حضور ﷺ کی حفاظت کو یقینی بنایا گیا۔ آیات زیر مطالعہ میں خاص طور پر اسی واقعہ کا تذکرہ ہے۔

آیت ۱۱ ﴿اَرَءَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰٓى ۝۱۱﴾ ’’کیا تم نے غور کیا اگر وہ شخص ہدایت پر ہوتا؟‘‘

آیت ۱۲ ﴿اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى ۝۱۲﴾ ’’یا وہ تقویٰ کی تعلیم دیتا!‘‘

جیسا کہ سورۃ اللیل کی آیت ۱۰ کے ضمن میں بھی ذکر ہو چکا ہے کہ ابوجہل کے کردار میں بہت سی مثبت خصوصیات بھی پائی جاتی تھیں۔ مثلاً وہ مال خرچ کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ صاف گو بھی تھا۔ اپنے ایمان نہ لانے کی وجہ بتاتے ہوئے اس نے بالکل کھری اور سچی بات کہی تھی کہ میں محمد (ﷺ) کو جھوٹا نہیں سمجھتا‘ لیکن ہمارے خاندان نے چونکہ غرباء کو کھانے کھلانے اور حاجیوں کی خدمت کرنے میں ہمیشہ بنو ہاشم کا مقابلہ کیا ہے‘ اس لیے اب میں محمد (ﷺ) کی نبوت کی شہادت دے کر اپنے حریف خاندان کی بڑائی تسلیم نہیں کر سکتا۔ وہ جری اور بہادر ایسا تھا کہ نزع کے وقت بھی اُس نے ہار نہیں مانی اور میدانِ بدر میں اپنا سر قلم کرنے والے شخص کو مخاطب کر کے یہ کہنا ضروری سمجھا کہ اس کی گردن کو ذرا نیچے سے کاٹا جائے تاکہ سر نیزے پر چڑھے تو اونچا نظر آئے۔ بہرحال شخصی اعتبار سے وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرح بہادر‘ نڈر‘ بے باک اور صاف گو انسان تھا۔ اگر وہ ایمان لے آتا تو یقیناً حضرت عمرؓ ہی کی طرح اعلیٰ پائے کا مسلمان ہوتا۔ لیکن جب وہ ﴿صَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝۶﴾ (اللیل) یعنی تصدیقِ حق کی گھاٹی

عبور کرنے میں ناکام رہا تو اُس کے کردار کی بہت سی مثبت خصوصیات بھی اس کے کسی کام نہ آ سکیں۔

آیت ۱۳ ﴿اَرَءَیۡتَ اِنۡ کَذَّبَ وَ تَوَلّٰی ﴿۱۳﴾﴾ ''کیا تم نے سوچا کہ اس نے جو جھٹلایا ہے اور منہ موڑ لیا ہے۔''

آیت ۱۴ ﴿اَلَمۡ یَعۡلَمۡ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی ﴿۱۴﴾﴾ ''کیا یہ جانتا نہیں کہ اللہ دیکھ رہا ہے!''

آیت ۱۵ ﴿کَلَّا لَئِنۡ لَّمۡ یَنۡتَہِ ۬ۙ﴾ ''ہرگز نہیں! اگر یہ باز نہ آیا''

﴿لَنَسۡفَعًۢا بِالنَّاصِیَۃِ ﴿۱۵﴾﴾ ''تو ہم گھسیٹیں گے اس کی پیشانی کے بال پکڑ کر۔''

آیت ۱۶ ﴿نَاصِیَۃٍ کَاذِبَۃٍ خَاطِئَۃٍ ﴿۱۶﴾﴾ ''وہ پیشانی کہ جو خطا کار ہے' جھوٹی ہے۔''

آیت ۱۷ ﴿فَلۡیَدۡعُ نَادِیَہٗ ﴿۱۷﴾﴾ ''تو وہ بلا لے اپنی مجلس کے لوگوں کو۔''

آیت ۱۸ ﴿سَنَدۡعُ الزَّبَانِیَۃَ ﴿۱۸﴾﴾ ''ہم بھی بلا لیں گے جہنّم کے فرشتوں کو۔''

آیت ۱۹ ﴿کَلَّا ؕ لَا تُطِعۡہُ وَ اسۡجُدۡ وَ اقۡتَرِبۡ ﴿۱۹﴾﴾ ''کوئی بات نہیں! (اے نبی ﷺ) آپ اس کی بات نہ مانیے' آپ سجدہ کیجیے اور (اللہ سے اور) قریب ہو جائیے!''

آپ ﷺ اس جھوٹے' غلط کار شخص کی ایک نہ سنیے۔ یہ اگر آپؐ کو نماز پڑھنے سے منع کرتا ہے تو اس کی پروا نہ کیجیے۔ آپؐ اپنے پروردگار کی جناب میں سجدے کرتے رہیے اور کثرتِ سجود سے اُس کا قرب حاصل کرتے رہیے۔ ❁❁

سُوۡرَۃُ الۡقَدۡرِ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃِ الۡقَدۡرِ ۚ﴿۱﴾ وَ مَاۤ اَدۡرٰىکَ مَا لَیۡلَۃُ
الۡقَدۡرِ ؕ﴿۲﴾ لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ ۬ۙ خَیۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَہۡرٍ ؕ﴿۳﴾ تَنَزَّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ
وَ الرُّوۡحُ فِیۡہَا بِاِذۡنِ رَبِّہِمۡ ۚ مِنۡ کُلِّ اَمۡرٍ ۙ﴿۴﴾ سَلٰمٌ ۟ۛ ہِیَ حَتّٰی
مَطۡلَعِ الۡفَجۡرِ ٪﴿۵﴾

آیت ۱ ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ۝۱﴾ ’’یقیناً ہم نے اتارا ہے اس (قرآن) کو لیلۃ القدر میں۔‘‘

’’اَنْزَلْنٰهُ‘‘ کی ضمیر مفعولی کا مرجع بالاتفاق قرآن مجید ہی ہے۔ نوٹ کیجیے! ان سورتوں کے مضامین کے اندر ایک ربط پایا جاتا ہے‘ یعنی پہلی وحی (سورۃ العلق) کے فوراً بعد بتایا جا رہا ہے کہ ہم نے اس کلام کو لیلۃ القدر میں نازل فرمایا ہے۔ قدر کا معنی تقدیر اور قسمت بھی ہے اور عزّت و منزلت بھی۔ یہاں دونوں معنی مراد لیے جا سکتے ہیں۔ یعنی ہم نے اس قرآن کو اس رات میں اتارا ہے جو قدر و منزلت کے اعتبار سے بے مثل رات ہے‘ یا اس رات میں اتارا ہے جو تقدیر ساز ہے۔ سورۃ الدخان میں اس رات کا ذکر لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ کے نام سے آیا ہے: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ﴾ (آیت ۳) ’’یقیناً ہم نے نازل کیا ہے اس (قرآن) کو ایک مبارک رات میں‘‘۔ یہ کونسی رات ہے؟ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((تَحَرَّوْا لَیْلَةَ الْقَدْرِ فِی الْوِتْرِ مِنَ الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ))[1] ’’لیلۃ القدر کو رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرو‘‘۔ زیادہ تر لوگوں کا خیال ہے کہ ستائیسویں رمضان کی شب ہی لیلۃ القدر ہے۔ لیکن جیسا کہ سورۃ الفجر کی آیت ۳ کے ضمن میں بھی وضاحت کی جا چکی ہے‘ قمری کیلنڈر کی طاق اور جفت راتوں کی گنتی دنیا کے مختلف خطوں میں مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً آج ہمارے ہاں جو طاق رات ہے سعودی عرب میں ممکن ہے وہ جفت رات ہو۔ اس لیے لیلۃ القدر کو تلاش کرنے کا محتاط طریقہ یہی ہے کہ اسے رمضان کے آخری عشرے کی تمام راتوں (جفت اور طاق دونوں) میں تلاش کیا جائے۔ اور اگر واقعی ستائیسویں رمضان کی شب ہی لیلۃ القدر ہے تو اس بارے میں میرا اپنا خیال یہ ہے کہ پھر یہ مکّہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی ستائیسویں شب ہے۔ واللہ اعلم!

اس رات میں قرآن نازل کرنے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس رات کو پورا قرآن مجید لوحِ محفوظ سے حاملینِ وحی فرشتوں کے سپرد کر دیا گیا اور پھر اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ۲۳ سال کے دوران میں حضرت جبرائیل علیہ السلام اس کی آیات اور سورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل

۱۔ صحیح البخاری‘ کتاب صلاۃ التراویح‘ باب تحری لیلۃ القدر فی الوتر من العشر الاواخر۔ و صحیح مسلم‘ کتاب الصیام‘ باب فضل لیلۃ القدر...

کرتے رہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے نزول کی ابتدا اس رات سے ہوئی۔

آیت ۲ ﴿وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۝۲﴾ ''اور تم کیا جانتے ہو کہ لیلۃ القدر کیا ہے!''

اس استفہام سے اس رات کی عظمت و اہمیت واضح ہوتی ہے۔ گویا مخلوق اس کی تہ تک پوری طرح نہیں پہنچ سکتی' صرف اللہ جل جلالہٗ ہی اس کی قدر و منزلت کو پوری طرح جانتا ہے۔

آیت ۳ ﴿لَيْلَةُ الْقَدْرِ ۙ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ ۝۳﴾ ''لیلۃ القدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔''

یہ بہتری اور افضلیت کس اعتبار سے ہے؟ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ اس رات کا عمل خیر ہزار مہینوں کے عمل خیر سے بہتر ہے جس میں لیلۃ القدر نہ ہو۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((مَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ اِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ))(۲) ''جو شخص لیلۃ القدر میں ایمان کے ساتھ اور اللہ سے اجر کی امید میں کھڑا رہا اُس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے گئے''۔ اس رات کی افضلیت کے ضمن میں ایک رائے یہ ہے کہ اس ایک رات میں اتنی خیر تقسیم کی جاتی ہے جتنی ایک ہزار مہینہ میں بھی تقسیم نہیں کی جاتی۔ اس رات کی افضلیت کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ انسان کی اصلاح اور فلاح کے لیے جو کام (نزولِ قرآن) اس ایک رات میں ہوا' خیر اور بھلائی کا اتنا بڑا کام کبھی انسانی تاریخ کے کسی طویل زمانے میں بھی نہ ہوا تھا۔ واضح رہے کہ اہلِ عرب بڑی کثیر تعداد کا تصوّر دلانے کے لیے اَلْف (ہزار) کا لفظ بولتے تھے۔

آیت ۴ ﴿تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۚ مِّنْ كُلِّ اَمْرٍ ۝۴﴾ ''(اس رات میں) اُترتے ہیں فرشتے اور روح اپنے رب کے حکم سے ہر کام کے لیے۔''

روح سے مراد یہاں روح الامین یعنی حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔ حضرت جبرائیلؑ فرشتوں کے سردار ہیں اور اللہ تعالیٰ کے ہاں انہیں خصوصی مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ جیسا کہ سورۃ التکویر میں فرمایا گیا: ﴿ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۝۲۰ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۝۲۱﴾ ''وہ (جبرائیلؑ)

۲۔ صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب من صام رمضان ایمانا واحتسابا ونیۃ۔ وصحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا' باب الترغیب فی قیام رمضان وھو التراویح۔

بہت قوت والا ہے‘ صاحبِ عرش کے قرب میں اس کا ٹھکانہ ہے۔ اس کی اطاعت کی جاتی ہے اور وہاں وہ امانت دار بھی ہے‘‘۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں حضرت جبرائیل علیہ السلام اور فرشتوں کا ذکر آتا ہے تو انؑ (حضرت جبرائیلؑ) کا ذکر عام طور پر علیحدہ کیا جاتا ہے۔

لیلۃ القدر میں حضرت جبرائیل علیہ السلام اور فرشتوں کا خصوصی نزول دراصل اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل و تنفیذ کے حوالے سے ہوتا ہے۔ سورۃ الدخان میں لیلۃ القدر یا لیلۃ مبارکہ کے بارے میں ایک خصوصی بات یہ بتائی گئی ہے: ﴿فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۝۴﴾ کہ اس رات میں تمام پُرحکمت امور کے فیصلے صادر کیے جاتے ہیں۔ (اسی لیے اسے ’’لَیْلَۃُ الْحُکْمِ‘‘ بھی کہتے ہیں) سورۃ الدخان کے مطالعے کے دوران اس آیت کے تحت اس موضوع پر تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے۔ مختصراً یہ کہ لیلۃ القدر اللہ تعالیٰ کی تکوینی سلطنت سے متعلق فیصلوں کے لیے سالانہ بجٹ سیشن کا درجہ رکھتی ہے۔ اس رات میں اگلے سال کے لیے تمام اہم امور کے فیصلے کر کے تعمیل و تنفیذ کی غرض سے فرشتوں کے حوالے کر دیے جاتے ہیں۔ چنانچہ فرشتے حضرت جبرائیلؑ کی قیادت میں ان احکامات پر عمل درآمد کے لیے پوری زمین میں پھیل جاتے ہیں۔ نظامِ کائنات سے متعلق اللہ تعالیٰ کی اس ’’تدبیرِ امر‘‘ کا ذکر سورۃ السجدۃ کی اس آیت میں بھی آیا ہے: ﴿يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ﴾ (آیت ۵) ’’وہ تدبیر کرتا ہے اپنے امر کی آسمان سے زمین کی طرف‘ پھر وہ (امر) چڑھتا ہے اُس کی طرف‘‘۔ گویا اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل کے بعد متعلقہ فرشتے تکمیلی رپورٹیں بھی بھیجتے ہیں۔

آیت ۵ ﴿سَلٰمٌ ۛ﴾ ’’سراسر سلامتی ہے۔‘‘

اس سلامتی کے بہت سے پہلو ہیں۔ مثلاً اس رات میں لوگوں کی دعائیں قبول ہوتی ہیں اور عبادت کا ثواب کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔

﴿هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ ۝۵﴾ ’’یہ (رات) رہتی ہے طلوعِ فجر تک۔‘‘ ❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
’’بیان القرآن‘‘ کے ترجمہ و ترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں‘
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

فتنۂ قادیانیت: زوال کا آغاز

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

[ستمبر ۱۹۷۴ء میں قادیانیوں کے غیر مسلم اقلیت قرار دیے جانے کے بعد ''میثاق'' اکتوبر/نومبر ۱۹۷۴ء کا اداریہ]

جس وقت ''میثاق'' کا یہ شمارہ طبع ہو کر قارئین کے ہاتھوں میں پہنچے گا' اُس وقت تک قادیانیوں کے غیر مسلم اقلیت قرار دیے جانے کا فیصلہ خاصا پرانا ہو چکا ہوگا۔ تاہم جی نہیں مانتا کہ ''میثاق'' کے صفحات اللہ تعالیٰ کے اُس احسانِ عظیم پر اُس کی جناب میں ہدیۂ تشکّر و امتنان پیش کرنے کی سعادت سے بالکل محروم رہ جائیں جو اس فیصلے کی صورت میں پوری ملّتِ اسلامیہ پر ہوا ہے۔ اگرچہ عالَمِ اسباب میں اس تاریخی فیصلہ کے بہت سے عوامل ہیں' تاہم واقعہ یہ ہے کہ فی الحقیقت یہ سب کچھ ایک خالص خدائی تدبیر کے نتیجے میں ہوا' جس نے جملہ اسباب وعوامل کو طوعاً و کرہاً اس طرح ایک ہی رخ میں پھیر دیا کہ اس فیصلے سے فرار کی کوئی راہ کسی کے لیے کھلی ہی نہ رہی اور بالکل معجزانہ طور پر وہ کٹھن مرحلہ طے ہو گیا جس کے طے ہونے کا کوئی امکان آج سے چھ ماہ قبل کسی بڑے سے بڑے سیاسی پنڈت کو بھی نظر نہ آ سکتا تھا۔

اگرچہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانِ مبارک کے مطابق کہ ((مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَا یَشْکُرُ اللّٰہَ)) ''جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کر سکتا'' پوری ملّتِ اسلامی کی جانب سے مبارک باد اور شکریے کے مستحق ہیں وہ عوام بھی جنہوں نے دینی غیرت اور حمیت کا بھرپور ثبوت بھی دیا اور صبر و تحمل اور نظم و ضبط کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ پھر علماء کرام اور دینی و سیاسی جماعتوں کے رہنما اور کارکن بھی جنہوں نے نہایت منظم طریقے پر عوام کے جذبات کی ترجمانی کا فرض سرانجام دیا۔ اس سلسلے میں سخت محنت

اور مشقت بھی برداشت کی اور ہر طرح کے خطرات بھی مول لیے‘ یہاں تک کہ قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں۔ خصوصاً مولانا محمد یوسف بنوری جنہوں نے علالت و پیرانہ سالی اور ضعف و نقاہت کے باوجود ایسی شدید مشقت برداشت کی جس کا تحمل صحت مند نوجوانوں کے لیے بھی مشکل ہو۔ مبارک باد اور شکریے کے مستحق ہیں ارکانِ پارلیمنٹ بھی جنہوں نے عوام کے جذبات کا بھی پورا لحاظ کیا اور خود بھی دیانت دارانہ اور حقیقت پسندانہ روش اختیار کی۔ حکومتِ وقت بھی جس نے نہ اسے اپنے وقار کا مسئلہ بنایا‘ نہ نوشتہ دیوار کو پڑھنے سے انکار کیا‘ خصوصاً مسٹر بھٹو جو سیاسی تدبّر اور فہم و فراست کے اس کڑے امتحان سے کامیابی کے پھریرے اڑاتے ہوئے نکلے۔ لیکن ہمارے شکر و سپاس کا اصل حق دار اور ہمارے تشکر و امتنان کا سزاوارِ حقیقی ہے اللہ ربّ العالمین جو ’’فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ‘‘ بھی ہے اور ’’غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِہٖ‘‘ بھی اور جس کے قبضہ قدرت میں ہیں تمام اسباب و علل اور جملہ وسائل و عوامل۔ فلہ الحمد فی السموت والارض ولہ الحمد فی الدنیا والآخرۃ۔

راقم الحروف ۲۴ مئی سے ۳۰ جون تک لاہور سے تقریباً مسلسل باہر رہا۔ پہلے کچھ بحالیٔ صحت اور کچھ بعض معاملات و مسائل پر گوشہ تنہائی میں غور و فکر کے پیش نظر ایک سفر ایبٹ آباد اور وادیٔ کاغان کا ہوا۔ پھر ایک طویل دورہ کراچی اور سندھ کے بعض دوسرے شہروں کا رہا۔ اسی دوران میں جب ’’حادثہ ربوہ‘‘ کی خبر پڑھی تو فوراً یہ خیال دل میں پیدا ہوا کہ غالباً تقدیر الٰہی میں فتنہ قادیانیت کی جس قدر مہلت طے تھی وہ پوری ہو چکی اور یہ رسّی جتنی دراز ہونی مقدر تھی وہ ہو چکی۔ آج سے اس کے زوال کا آغاز ہو گیا۔ گویا ایک انگریزی محاورے کے مطابق: ’’This is the beginning of their end!‘‘ تبھی تو ان کی عقل ماری گئی اور ایسے ہوشیار‘ کیّاد‘ شاطر گروہ کے ہاتھوں اتنی بڑی حماقت کا ارتکاب ہو گیا۔ چنانچہ اثنائے سفر میں نجی گفتگوؤں میں راقم اپنے اس تاثر کا اظہار کرتا رہا۔ جب ۲۸ جون کو سکھر کی نئی تعمیر شدہ لیکن قدیم بادشاہی طرز کی عظیم جامع مسجد میں اجتماعِ جمعہ سے خطاب کا موقع ملا تو وہاں بھی اپنے اس یقین کا اظہار کیا کہ یہ ایک خالص

خدائی تدبیر ہے اور اس بار یہ مسئلہ‘ ان شاء اللہ العزیز‘ ضرور تسلی بخش طریقے پر طے ہوجائے گا۔ پھر تقریباً ڈیڑھ ماہ کی غیر حاضری کے بعد راقم نے ۵ جولائی کو جامع مسجد خضراء‘ سمن آباد میں جمعہ پڑھایا تو ایک مفصّل تقریر میں پھر اسی توقع کا اظہار کیا۔ یہ تقریر ریکارڈ کر لی گئی تھی‘ اور محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب نے اسے صفحہ قرطاس پر بھی منتقل کرلیا۔ ان کی شدید خواہش تھی کہ اسے ’’میثاق‘‘ میں شائع کر دیا جائے لیکن اُس وقت سنسر کی پابندی کے باعث ایسا ممکن نہ ہوسکا۔ ذیل میں اس کا ابتدائی حصّہ درج کیا جا رہا ہے تاکہ ایک تو ان کی خواہش پوری ہو جائے اور دوسرے یہ نہ کہا جا سکے کہ ہمارے یہ خیالات وقوعہ کے پیش آچکنے کے بعد کی خیال آرائیوں کے قبیل سے ہیں۔

(تقریر کا بقیہ حصّہ جو ’’عقیدۂ ختم نبوت اور قرآنِ حکیم‘‘ کے موضوع پر اظہارِ خیال پر مشتمل ہے‘ ان شاء اللہ آئندہ اشاعت میں شائع کر دیا جائے گا!)

’’حمد وثنا اور تلاوتِ آیات کے بعد:

’’حضرات! ۲۴ مئی کے بعد آج ۵ جولائی کو ملاقات ہو رہی ہے۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ اِدھر تو جمعہ کے ان اجتماعات میں میرے خطابات کا سلسلہ عارضی طور پر لاہور سے باہر جانے کے سبب سے معطل ہوا اور اُدھر ملک میں ایک نہایت ہیجان انگیز واقعہ پیش آ گیا‘ یعنی حادثہ ربوہ۔ اس کے بعد پوری شدّت کے ساتھ اس مسئلے نے سر اٹھالیا جو اگرچہ موجود تو تقریباً ایک صدی سے ہے لیکن جس کا شدت کے ساتھ احساس ۱۹۵۳ء میں ہوا تھا۔ ۱۹۵۳ء کے حوادث کے بعد یہ مسئلہ دوبارہ بالکل دب گیا تھا۔ بجز اس کے کہ بعض افراد جیسے جناب شورش کاشمیری اور ہمارے بزرگ حکیم عبدالرحیم اشرف اس کی فتنہ سامانی کی طرف توجّہ دلاتے رہتے تھے یا بعض ادارے وقتاً فوقتاً کچھ کتابچے اور پمفلٹ اس کے بارے میں شائع کرتے رہتے تھے‘ کوئی عوامی تحریک موجود نہ تھی۔ اب ربوہ کے حادثہ نے اس کو ازسرِنو زندہ کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلی مرتبہ اس کی حقیقی فتنہ انگیزی‘ سازشی فطرت اور مکاری کا ملک گیر احساس اجاگر ہوا اور ایوانِ حکومت سے خواص وعوام تک سب کی توجہ ادھر مبذول ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس مرتبہ جو یہ مسئلہ اٹھا

تو وہ کسی سیاسی پارٹی کی کوشش اور محنت سے نہیں اٹھا۔ حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ خالص ایک خدائی تدبیر ہے کہ اس طائفے کی عقل ماری گئی اور اس نے خود ہی اپنے ایک انتہائی غلط اقدام سے اس مسئلے کو زندہ کر دیا!

یہ فتنہ اپنے سازشی کردار اور انتہائی مہارت کے ساتھ خاموشی سے جسدِ ملّت میں سرطان کے پھوڑے کی طرح جڑیں جمانے کے اعتبار سے پوری ملّتِ اسلامیہ کی تاریخ میں منفرد مقام رکھتا ہے۔ عام طور پر لوگوں کو اس کی ہلاکت خیزی کا اندازہ نہ تھا' بلکہ تعلیم یافتہ حضرات میں سے بھی اکثر اس سے بالکل ناواقف تھے' یا اس کے بارے میں گوناگوں غلط فہمیوں میں مبتلا تھے۔ اس مرتبہ جو یہ مسئلہ اٹھا ہے تو اگرچہ قادیانیوں نے تو اس کا کریڈٹ بھٹو صاحب کو دینے کی کوشش کی ہے تاہم اسے بھی ان کی سابقہ مکاریوں کا ایک تتمہ یا ضمیمہ ہی سمجھنا چاہیے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دفعہ اس مسئلہ کے اُبھرنے اور اُٹھنے میں نہ حکومت کا کوئی عمل دخل ہے نہ کسی اپوزیشن پارٹی کا ہاتھ' بلکہ علماء کی کسی تنظیم یا جماعت کا بھی اس میں کوئی دخل نہیں ہے! حقیقت یہ ہے کہ اس بار کوئی شخص اور سیاسی پارٹی یہ کریڈٹ لینے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ اس مرتبہ یہ مسئلہ ایک خالص خدائی تدبیر کے تحت اٹھا ہے۔

میرے اس یقین کی بنیاد یہ حقیقت ہے کہ اس مرتبہ قادیانیوں کی طرف سے ربوہ سٹیشن پر جو اقدام ہوا وہ ان کے اپنے اساسی فلسفے' بنیادی طریق کار اور سابق طرزِ عمل سے بالکل مختلف ہے۔ ان کا رویہ اور طریقہ ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ حکومتِ وقت کو سلام کرو اور اس کی کاسہ لیسی' مدح سرائی اور ثنا خوانی کر کے اس سے مراعات حاصل کرو۔ پھر ان مراعات کے تحت غیر محسوس طور پر اندر ہی اندر اپنی جڑیں پھیلاؤ۔ اُمّتِ مُسلمہ کے ساتھ براہِ راست تصادم سے ہمیشہ کنّی کترانا ان کا وطیرہ رہا ہے۔ یہی ان کا ابتدا سے فلسفہ ہے' یہی ان کا طریق کار ہے۔ انہوں نے نہ کبھی سیاسی میدان میں خود کو نمایاں کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی کسی موقع پر جارحیت کا کوئی انداز اختیار کیا۔ اس لیے کہ سیاست کا مبتدی طالب علم بھی یہ بات جانتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی جمعیتیں اور جماعتیں یا فرقے اور گروہ کسی ملک میں بھی جارح ہو کر نہیں جی سکتے۔ مظلوم و مجروح ہو کر رہنے میں تو پھر بھی ان

کے زندہ رہنے کا امکان رہتا ہے۔ جارحیت کی صورت میں تو سوائے خاتمے کے اور کوئی صورت ہی نہیں۔ یہی فلسفہ تھا جس کے سہارے یہ آج تک پنپتے رہے ہیں۔ اسی فلسفے پر وہ انگریزی دور میں پوری طرح کاربند رہے۔ حکومت برطانیہ کی قصیدہ گوئی‘ اس کی خوشامد‘ اس کو رحمتِ خداوندی قرار دے کر‘ اس کو بقاوترقی کی دعائیں دے کر‘ اس کے مقاصد ومفادات میں مدد ومعاون ہو کر‘ اس کے زیرسایہ اور زیرعاطفت رہ کر اور اس سے مراعات حاصل کر کے جسدِ ملّت میں یہ سرطان کے مانند اپنی جڑیں پھیلاتے رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی یہ اسی طریق کار پر عمل پیرا رہے ہیں کہ خواہ کوئی بھی حکومت ہو اور کوئی بھی شخص یا جماعت برسرِاقتدار ہو‘ خود کو اس کا وفادار ثابت کریں اور خوشامد کے ذریعے مراعات پر مراعات حاصل کرتے چلے جائیں۔ یہ پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ نہ صرف ان کی طرف سے جارحیت کا ارتکاب ہوا بلکہ انہوں نے اس جارحیت کو وقت کی حکمران سیاسی پارٹی سے منسوب کرنے کی حماقت کر کے حکومتِ وقت کو اپنے مدِمقابل لا کھڑا کیا۔ گویا ان کی حماقت کے نتیجے میں حکومت اور عوام دونوں ایک صف میں کھڑے ہو گئے۔ یوں حکمران جماعت اور اپوزیشن کے مابین کسی قسم کی سیاسی غلط فہمی کے پیدا ہونے کا امکان ختم ہو گیا۔ لہٰذا ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ایک طرف تو یہ مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا اور دوسری طرف خود بخود حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ سیاسی پارٹیوں کی باہمی کشاکش کی نوبت آئے بغیر یہ اُمید پیدا ہو چلی ہے کہ اس مرتبہ‘ اِن شاء اللہ‘ اس مسئلہ کا ایسا حل ضرور نکل آئے گا جو اُمّت کے لیے قابلِ قبول ہو۔ اس سے پہلے کبھی ایسی صورتِ حال رونما نہیں ہوئی۔ بحمد اللہ‘ اس حد تک تو معاملہ آ گیا ہے کہ ایک طرف اعلیٰ سطحی تحقیقاتی عدالت کا تقرر ہوا ہے جس کے Terms of Reference کافی وسیع کر دیے گئے ہیں۔ تمام معاملات اس عدالت کے سامنے لائے جا رہے ہیں۔ یوں اس گروہ کا گھناؤنا کردار تحقیقاتی عدالت کے سامنے آ جائے گا اور یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے گی کہ اس گروہ کا مقام دائرہ ملّت کے اندر نہیں بلکہ باہر ہے۔ دوسری طرف اس ملک کے سب سے بااختیار ادارے یعنی پارلیمنٹ میں بھی اس مسئلے پر باقاعدہ غور وفکر

شروع ہو گیا ہے۔ یہ دونوں صورتیں اس مسئلہ کے صحیح حل کے لیے نہایت مناسب ہیں۔ اس بات سے بالکل قطع نظر کر لیجیے کہ اس مسئلہ کے حل سے کس کا کیا مفاد وابستہ ہے۔ حکمران پارٹی کیا چاہتی ہے اور اپوزیشن پارٹیاں کیا چاہتی ہیں! ان سب سے صرفِ نظر کرتے ہوئے میں عرض کرتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے شکر کا مقام ہے کہ اس مسئلہ کے حل کے لیے قانونی اور دستوری طور پر ممکنہ صحیح اقدامات کر لیے گئے ہیں اور یہ اُمید پیدا ہو چلی ہے کہ اس مرتبہ یہ مسئلہ ان شاء اللہ ضرور حل ہو جائے گا۔

البتہ اس موقع پر تین احتیاطوں کی ضرورت ہے:

* ایک احتیاط تو عوام کو کرنی چاہیے کہ معاملہ کسی صورت میں بھی ہنگامہ، ایجی ٹیشن اور دنگے فساد کی شکل اختیار نہ کرنے پائے، اس لیے کہ یہ قادیانیوں کے جال میں پھنسنے کے مترادف ہوگا۔ بعض معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ۱۹۵۳ء میں بھی قادیانیوں نے پاکستان سے نقل مکانی کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ان کی یہ کوشش بھی تھی کہ کسی طرح ہنگامہ کی صورت پیدا ہو اور حکومت اور عوام کے مابین شدید نوعیت کا تصادم پیدا ہو جائے۔ جب وہ اس میں کامیاب ہو گئے اور مارشل لاء لگ گیا تو وہ جو چاہتے تھے وہ ہو گیا، یوں ان کے قدم جم گئے۔ اب بھی ان کی طرف سے اشتعال انگیزی کی جا رہی ہے۔ جہاں بھی فساد اور لوٹ مار کا معاملہ ہوا یا فائرنگ تک نوبت پہنچی وہاں ابتدا ان ہی کی طرف سے ہوئی ہے۔ انہوں نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ ایک ہنگامہ خیز اور دھما کا خیز صورت بنا کر حالات کا رُخ اس طرف پھیر دیا جائے کہ ملک میں امن و امان کا گمبھیر مسئلہ اُٹھ کھڑا ہو، تاکہ حکومت اور عوام میں خوف ناک تصادم ہو جائے۔ نتیجۃً موجودہ دستوری اور آئینی نظام درہم برہم ہو جائے اور اختیارات فوج کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائیں۔ فوج کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو کسی سیاسی یا دینی مسئلہ کی تائید یا مخالفت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ خالص انتظامی معاملہ سمجھ کر امن و امان قائم کرنے کے لیے ہر قسم کی بدامنی اور ہنگامے کو فرو کر دینا اپنا فرضِ منصبی سمجھتی ہے۔ لہٰذا قادیانیوں کو اسی میں اپنی عافیت نظر آتی ہے کہ ملک میں بڑے پیمانہ پر

لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ کھڑا کر دیا جائے۔ ربوہ میں کسی جگہ نمایاں طور پر یہ عبارت لکھی گئی تھی کہ ''خدا اپنی فوجوں کے ساتھ آ رہا ہے۔'' گویا انہوں نے اپنی طرف سے اس بات کا پورا اہتمام کر لیا تھا کہ کسی طرح ملک میں سول ایڈمنسٹریشن فیل ہو جائے اور فوج انتظامیہ کے اختیارات اپنے ہاتھ میں سنبھال لے تاکہ ایک طرف دستور معطل ہو جائے اور دوسری طرف وہ اپنے سازشی طور طریقوں سے فوج کو متاثر کر کے فائدہ اٹھا سکیں۔ لہٰذا اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ عوام ہر قسم کی اشتعال انگیزی پر ضبط و تحمل اور صبر سے کام لیں اور کسی وقت بھی کوئی ایسی صورت حال پیدا نہ ہونے دیں جس سے لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ کھڑا ہو جائے۔ اگر اس قسم کا کوئی بھی معاملہ ہو گیا تو درحقیقت یہ قادیانیوں کی تدبیر کی کامیابی ہو گی اور گویا ہم خود ان کے جال میں پھنس جائیں گے۔

* دوسری احتیاط تمام سیاسی اور دینی پارٹیوں کو یہ کرنی چاہیے کہ اس مسئلہ کے اُٹھانے اور اس کے حل کا کریڈٹ لینے کی کوشش سے بھرپور اجتناب کیا جائے۔ اس مسئلے سے سیاسی مفاد حاصل کرنے کی ادنیٰ سی کوشش بھی پورے معاملہ کو خراب کر سکتی ہے' لہٰذا اس سے دامن بچانا از حد ضروری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس موقع پر کسی پارٹی کی جانب سے اس رجحان کا اظہار کہ یہ معاملہ اس کی کوششوں سے اٹھا ہے اور اس کی کامیابی کا سہرا اس کے سر بندھنا چاہیے' انتہائی تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔

* تیسری احتیاط یہ ہونی چاہیے کہ کسی موقع پر بھی اس معاملہ کو حکومت اور حزبِ اختلاف کے مابین طاقت آزمائی کا رنگ نہ دیا جائے۔ ماضی میں ایسا ہو چکا ہے کہ اس مسئلے سے بعض گروہوں اور سیاسی پارٹیوں نے سیاسی مفادات حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس کو حکومت versus حزبِ اختلاف کا مسئلہ بنا دیا' جس کے نتیجہ میں مسئلہ حل ہونے کے بجائے لاینحل بن گیا۔ اس سلسلے میں یہ بات نہایت اُمید افزا اور اطمینان بخش ہے اور گویا ایک نہایت نیک شگون کا درجہ رکھتی ہے کہ اس بار متحدہ مجلس عمل کی قیادت مولانا سید محمد یوسف بنوری مدظلہ کو سونپی گئی ہے' جو ایک خالص غیر سیاسی شخصیت ہیں۔ چاہے ملک کے ہر شہری کی طرح ان کے بھی کچھ مخصوص سیاسی نظریات ہوں' بہرحال وہ عملی سیاست کے میدان سے

بالکل علیحدہ رہتے ہوئے صرف علمی اور تدریسی مشاغل میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ مولانا کی قیادت میں یہ تحریک سیاست کی نذر ہونے سے بچ جائے گی اور معاملہ حکومت بمقابلہ احزاب اختلاف کا نہیں بنے گا' بلکہ مَیں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر مسئلے کے حل کا کریڈٹ حکمران پارٹی لینا چاہتی ہو تو وہ بے شک لے لے۔ ہمیں ساری دلچسپی اس سے ہونی چاہیے کہ اس مرتبہ کسی طرح یہ مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے مطالبے کے مطابق حل ہو جائے۔ میں اسی بات کو سکھر کے ایک اجتماع میں بھی بیان کر چکا ہوں' مختلف ذرائع سے اپنی یہ گزارشات علماء کرام اور سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں تک بھی پہنچا چکا ہوں اور آج پھر اس کا اظہار کر رہا ہوں کہ اس مرتبہ یہ مسئلہ قادیانیوں کی حماقت سے اور پورے زور شور سے اٹھا ہے۔ اس میں کسی سیاسی پارٹی کا کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ خالص خدائی تدبیر ہے۔ اللہ نے ہمیں موقع عطا فرمایا ہے کہ اس صورت حال سے صحیح فائدہ اٹھالیں۔ اگر ہم نے کفرانِ نعمت کیا تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مسئلہ کتنے طویل عرصے کے لیے دوبارہ سرد خانے میں چلا جائے۔ اس مسئلہ کو نئے سرے سے اٹھانا آسان نہیں ہوگا۔ ۱۹۵۳ء کے بعد سے یہ مسئلہ جس طرح دب گیا تھا وہ آپ کو معلوم ہے۔ لہٰذا اس موقع پر ہمیں پورے دینی اور سیاسی فہم کا ثبوت دینا چاہیے اور ہر قسم کی اشتعال انگیزی پر ضبط و تحمل کا ثبوت دیتے ہوئے پُرامن ذرائع سے اپنا مطالبہ جاری رکھنا چاہیے۔ دلائل سے اپنی بات منوانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہنگامہ آرائی سے دامن بچانا چاہیے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ حکومت کی سطح پر اس فتنہ پر تشویش کا اظہار ہوا ہے اور بڑی اعلیٰ سطح پر یہ احساس اُجاگر ہوا ہے کہ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنے اور اس کا صحیح حل تلاش کرنے کی واقعتاً ضرورت ہے۔ یہ صورتِ حال بڑی اطمینان بخش ہے۔ لہٰذا ہمیں موقع دینا چاہیے کہ ایوانِ نمائندگان پُرامن فضا میں اس مسئلہ کو اس صحیح حل تک پہنچا سکے جو پوری اُمّتِ مُسلمہ کے لیے قابلِ قبول ہو۔

جہاں تک اس مطالبہ کا تعلق ہے کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ مولانا امین احسن اصلاحی کے بقول اس سے زیادہ نرم

کوئی اور مطالبہ نہیں ہوسکتا‘ اس لیے کہ کسی کمیونٹی کو باقاعدہ اقلیت (minority) تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اسے بہت سے قانونی حقوق اور تحفظات دے دیے جائیں! یہ گویا ایک اعتبار سے اس کی قانونی حیثیت کا تعین اور بین الاقوامی سطح پر اس کے حقوق کا اعتراف ہے۔ اگر کوئی ملک کسی کمیونٹی کو اپنے ہاں اقلیت کی حیثیت سے تسلیم کر لے تو گویا اقوام متحدہ کے تمام ادارے اس کے پشت پناہ ہو گئے۔ یو این او اس کی کسٹوڈین بن گئی۔ بین الاقوامی عدالت اس کے معاملات میں مداخلت کی مجاز ہوگئی۔ بحیثیت اقلیت ان کے حقوق آپ کو باقاعدہ طے کرنے ہوں گے اور ان کو اپنی کتابِ دستور میں مندرج کرنا ہوگا۔ ان حقوق کی ادائیگی کی آپ کو ضمانت دینی ہوگی اور آپ کے ملک کی عدالتیں ان حقوق کی نگہداشت کریں گی۔ قادیانیوں کے لیے اس سے زیادہ فیاضانہ سلوک کا تصوّر تک نہیں کیا جاسکتا۔ ختمِ نبوت اُمّتِ مُسلمہ کا ایک ایسا اجماعی عقیدہ ہے کہ اس میں کسی اعتبار سے رخنہ ڈالنا یا دراڑ پیدا کرنا ہمیشہ سے ارتداد کی ایک پختہ اور متفق علیہ بنیاد رہی ہے۔ دوسری طرف قتلِ مرتد اور خصوصاً منظم مرتدین کے ساتھ قتال کے مسئلے پر بھی ہمیشہ سے اُمّت کا اجماع ہے۔ یہ تو اس دور کی ’’برکات‘‘ ہیں‘ بقول اکبرالٰہ آبادی:

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ
گلے میں جو آئیں وہ تانیں اڑاؤ
کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسر
’’انا الحق‘‘ کہو اور پھانسی نہ پاؤ!

کہ جس نے جو چاہا کہہ دیا اور جو جی میں آیا دعویٰ کر دیا اور اسے کوئی فکر نہیں کہ میرا حشر کیا ہوگا اور میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا! مرزا صاحب کے تمام دعاوی برٹش راج میں ہوئے۔ یہ دعوے برطانوی سامراج کے اپنے مفاد میں تھے۔ پھر مسلمانوں میں انتشارِ فکر و نظر اس کو عین مطلوب تھا‘ لہٰذا وہ کیوں ان کا نوٹس لیتا! اس نے تو ان کی سرپرستی کی اور خوب سرپرستی کی۔ اس کی سرپرستی اور نگہداشت میں یہ پودا نہیں‘ جھاڑ جھنکار نشوونما پاتا رہا۔ اگر کہیں خلافتِ راشدہ کا دَور ہوتا یا کوئی بھی اسلامی حکومت ہوتی تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا۔ ایسا دعویٰ کرنے

والے کا مقام دار و رسن ہوتا یا پھر اس دعویٰ کو ماننے والوں کے ساتھ باقاعدہ قتال ہوتا۔ ان کی جان اور ان کا مال مسلمانوں کے لیے مباح قرار پاتا اور ان کے ساتھ معاملہ وہی کیا جاتا جو متحارب کفار اور مشرکین کے ساتھ کیا جاتا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اُمّتِ مُسلمہ کا سینہ بڑا کشادہ رہا ہے۔ ہمارے ہاں تکفیر کا مسئلہ بہت ہی نازک مسئلہ سمجھا گیا ہے۔ عام طور پر جو یہ بات مشہور ہے کہ تکفیر ایک آسان سا معاملہ ہے تو یہ بہت بڑا مغالطہ ہے۔ ہمارے ہاں تکفیر کا معاملہ بہت کم ہوا ہے۔ عام طور پر ہمارے ہاں کفر کا فتویٰ مختلف عقائد اور اعمال پر لگتا رہا ہے۔ متعین افراد یا گروہوں کی باقاعدہ تکفیر شاذ ہی کبھی ہوئی ہے۔ گنتی کی مثالیں ہی ملیں گی کہ کسی اسلامی حکومت نے متعین طور پر کسی خاص شخص یا جماعت کی تکفیر کر کے اس کو جسدِ ملّت سے کاٹ پھینکا ہو۔ ارتداد یا تکفیر کا معاملہ انہی افراد کے ساتھ کیا گیا ہے کہ جن کے قول اور عقیدہ کی کوئی تاویل اور توجیہہ ممکن ہی نہ رہی ہو اور صریح ارتداد یا کفر کا ایسا ثبوت فراہم ہو گیا ہو جس کی تردید ممکن نہ ہو۔ پھر ایسے افراد کے ساتھ بھی انتہائی سزا یعنی قتل سے قبل پوری طرح افہام و تفہیم کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ اس کے مقابلے میں عیسائیت کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ معمولی' چھوٹی اور بالکل فروعی باتوں پر کیسی کیسی بہیمانہ اور وحشیانہ سزائیں دی جاتی تھیں اور کس طرح بے دریغ ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ ہمارا اجتماعی مزاج اس کے بالکل برعکس رہا ہے۔ البتہ قادیانیوں کا معاملہ یہ ہے کہ انہوں نے وہ رخنہ پیدا کیا ہے کہ اگر اس سے صرفِ نظر کیا گیا تو ملّت کی شیرازہ بندی ممکن ہی نہیں رہے گی۔

دعوائے نبوت درحقیقت ایسا فتنہ ہے کہ جس سے وہ بنیاد ہی منہدم ہو جاتی ہے جس پر اسلام کا قصر کھڑا ہے۔ نبوت سے کم تر درجہ کے بہت سے فتنے ہمارے ہاں اُٹھتے رہے اور اُمّت نے انہیں برداشت کیا ہے لیکن نبوت کے دروازے کو اگر ایک ہی بار کھول دیا گیا تو اُمّت میں تفریق کا ایک مسلسل عمل شروع ہو جائے گا جس کی پھر کوئی حد مقرر نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ اگر کوئی دعوائے نبوت کرے گا تو لازماً اس کے دو نتائج مترتب ہوں گے۔ اس کو ماننے والا مؤمن اور اس کا انکار کرنے والا کافر قرار پائے گا۔ نبی ایک میزان اور فرقان بن کر آتا ہے۔ وہ کفر و

ایمان کا معیار بن کر آتا ہے۔ جو اس کو نہ ماننے چاہے وہ دیگر تمام باتوں کو مانتا ہو یہاں تک کہ وہ خدا کو خالص توحید کے ساتھ مانتا ہو' آخرت کو مانتا ہو اور ان تمام تفاصیل کے ساتھ مانتا ہو جن کی خبر انبیاء و رسل دیتے چلے آئے ہیں' حضرت آدمؑ سے لے کر اس نبی سے پہلے آنے والے تمام نبیوں اور رسولوں کو مانتا ہو' تمام صحیفوں اور کتابوں کو مانتا ہو' ملائکہ کو مانتا ہو' بڑا ہی متقی ہو لیکن مجرد اس بات سے کہ اس نے ایک نبی کا انکار کر دیا' اس پر کفر کا ٹھپہ لگ جائے گا اور وہ مؤمن نہیں بلکہ کافر قرار پائے گا۔ گویا نبوت کا لازمی اور منطقی نتیجہ تفریق ہے۔ غور کیجیے کہ یہود اور نصاریٰ کے مابین آخر کیا چیز مابہ الاختلاف ہے؟ عیسائی اب بھی جس کتاب کو لیے پھرتے ہیں' اس میں انجیل (New Testament) کے ساتھ عہد نامہ عتیق (Old Testament) کے نام سے بنی اسرائیل کے انبیاء پر نازل ہونے والے تمام صحیفے شامل ہیں۔ گویا عیسائی تورات' زبور اور تمام صحیفوں کو بھی مانتے ہیں اور حضرت آدم سے حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام تک تمام نبیوں اور رسولوں کو بھی مانتے ہیں لیکن پھر بھی یہ دو علیحدہ علیحدہ اُمتیں ہیں۔ یہ فرق کیوں واقع ہوا؟ صرف اس لیے کہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کیا اور عیسائیوں نے ان کو مانا تو بنی اسرائیل میں تفریق ہو گئی۔ اب یہ دو بالکل جدا اُمتیں ہو گئیں۔ یہود کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ کو نبی اور رسول ماننے والے دائرہ ایمان سے خارج ہو کر کافر ہو گئے اور عیسائیوں کے نزدیک حضرت عیسیٰؑ کے انکار کی وجہ سے یہود کافر قرار پائے۔ مزید غور کیجیے کہ ہمارے اور عیسائیوں کے مابین فرق کیا ہے! یہاں میری مراد ان لوگوں سے ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا نبی اور رسول مانتے ہوں اور جو حقیقتاً حضرت مسیح ؑ کے متبع ہوں۔ ہم حضرت عیسیٰؑ کو مانتے ہیں لیکن یہ متبعین حضرت مسیح ؑ' ہمارے نبی سید المرسلین خاتم النّبیین ﷺ کو نہیں مانتے۔ لہٰذا ہمارے نزدیک وہ کافر اور ان کے نزدیک ہم کافر۔ گویا یہ وہ منطقی نتیجہ ہے جس تک خود قادیانیوں نے اس مسئلے کو پہنچایا ہے۔ جب وہ ایک نئی نبوت پر ایمان کے مدعی ہیں تو ان کے نزدیک اس نبوت کا انکار کرنے والے کافر اور ہمارے نزدیک اس نبوت کو ماننے والے کافر۔

اس حقیقت کو بھی اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ آخر کیا وجہ تھی کہ نئی نبوت کا کھڑاک مول لیا گیا! دراصل نبوت کی بنیاد پر جو تنظیم قائم ہوتی ہے اس سے زیادہ مضبوط تنظیم کا آپ تصوّر ہی نہیں کر سکتے۔ جس کسی نے کسی کو نبی مان لیا' اس نے گویا ہر اعتبار سے اپنے آپ کو اس نبی کی کامل فرماں برداری میں دے دیا اور خود کو بالکلیہ سرنڈر کر دیا۔ اب اس نبی کے مقابلے میں اس کا فکر' اس کی عقل اور اس کی رائے سب معطل ہو جائیں گے۔ کوئی شخص جب ظلّی طور پر' بروزی طور پر یا کسی اور اعتبار سے خود کو ایک مرتبہ نبی منوا لے تو اب وہ ماننے والے کے لیے امام معصوم بھی ہو گیا' واجب الاطاعت بھی ہو گیا۔ اس کی رائے سے اختلاف اور اس کے حکم سے انحراف کفر ہو جائے گا' حتیٰ کہ اس کے خلاف دل میں کدورت کے جذبات رکھنا بھی کفر کے زمرے میں آئے گا۔ پس ایسے شخص کے گرد جو تنظیم بنے گی اس سے زیادہ مضبوط تنظیم کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی تنظیم کے علاوہ جو دوسری تنظیمیں ہوں گی ان کے صدر سے' امیر سے' سربراہ سے آپ اختلاف کر سکتے ہیں' ان کے خلاف سوءِ ظن میں بھی مبتلا ہو سکتے ہیں' ان کی رائے کے مقابلہ میں اپنی رائے پیش بھی کر سکتے ہیں اور اس پر عمل بھی کر سکتے ہیں' کیونکہ یہاں معاملہ ایمان و کفر کا نہیں ہوتا' لیکن اس کے برعکس جہاں کسی کو نبی مان لیا گیا ہو وہاں ان تمام امکانات کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ امر واقعہ ہے کہ اس برصغیر میں قادیانیوں کی تنظیم سے بہتر اور مضبوط کوئی تنظیم نہیں ہے اور اس کا سبب یہی ''نبوت'' کا تصوّر ہے۔ یہ فائدہ نبوت کے دعویٰ کے بغیر حاصل ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔

پھر انہوں نے نبوت کے لازمی اور منطقی نتیجہ کو خود ہی لوگوں کے سامنے واضح کر کے پیش کر دیا۔ عامۃ المسلمین سے ان کی مساجد علیحدہ' نمازیں علیحدہ' یہاں تک کہ وہ ہمارے جنازے میں شرکت نہیں کریں گے[1]۔ حد یہ ہے کہ وہ ہمارے بچوں کے جنازے میں بھی شریک نہیں ہوں گے۔ یہ بات باقاعدہ سوال و جواب کی صورت میں ان کے لٹریچر میں موجود ہے۔ مرزا بشیر الدین محمود سے

(۱) مشہور ہے کہ چودھری سر ظفر اللہ خاں نے جو وزیر اعظم لیاقت علی خاں کی کابینہ میں وزیر امور خارجہ تھے' اپنے محسن' مربی اور بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی نمازِ جنازہ میں شرکت نہیں کی تھی۔

پوچھا گیا: بچے تو معصوم ہوتے ہیں‘ اگر غیر احمدی بچوں کے جنازہ کی نماز میں شرکت کر لی جائے تو کیا ہرج ہے؟ جواب دیا گیا: کیا آپ عیسائیوں کے بچوں کے نماز جنازہ میں شرکت کر سکتے ہیں؟ اسی طرح انہوں نے کسی غیر احمدی لڑکے سے احمدی لڑکی کا نکاح ناجائز اور غیر احمدی کی لڑکی سے احمدی کا نکاح جائز قرار دیا۔ دلیل یہ دی گئی کہ اہل کتاب کی لڑکیوں سے نکاح جائز لیکن ان کو لڑکی دینا ناجائز ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اس معاملہ کو منطقی انتہا تک تو قادیانی خود پہنچائیں‘ اس کے جملہ مضمرات کو کھول کر وہ خود واضح کریں اور پھر اس کا جو عملی نتیجہ نکلنا چاہیے‘ یعنی یہ کہ ان کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے تو یہ اس پر واویلا کریں۔ اس میں آخر کیا معقولیت ہے؟ خوب اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ اعتقادی طور پر وہ اپنے آپ کو خود ہی ایک علیحدہ اُمّت قرار دے چکے ہیں لیکن اس کے مقدرات کو اس لیے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اس طرح ان کے توسیع پسندانہ عزائم میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اُمّتِ مُسلمہ میں شامل رہ کر وہ جس طرح ہر قسم کے مادی فوائد سے متمتع ہو رہے ہیں‘ اس میں خلل واقع ہوتا ہے۔ غیر مسلم اقلیت ہونے کے باعث وہ حکومت کے تمام کلیدی مناصب سے محروم کر دیے جائیں گے۔ حکومت کے دفاتر اور محکمہ جات کی ملازمتوں میں عددی تناسب کے لحاظ سے ان کا کوٹا مقرر ہو جائے گا۔ تبلیغ اسلام کے نام سے جو زرمبادلہ کثیر مقدار میں وہ ہر سال حاصل کرتے ہیں‘ اس پر قدغن لگ جائے گی۔ مسلمانوں میں شامل رہنے کے سبب سے فوج‘ سفارت خانوں اور دیگر محکموں کے اعلیٰ عہدوں تک ان کو جو پہنچ اور دسترس حاصل ہے اس پر پابندی عائد ہو جائے گی۔ یہ نقصانات وہ ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ آکاس بیل کی طرح شجرِ ملّت سے لپٹے رہیں تاکہ اسی سے غذا حاصل کرتے رہیں اور اسی کی بربادی کا باعث ہوں۔ اسی لیے وہ واویلا مچا رہے ہیں اور خود کو ’’مسلمان‘‘ ثابت کرنے کے لیے اپنے روایتی دجل و فریب سے کام لے رہے ہیں۔ درحقیقت انہوں نے خود اپنے اختیار کردہ موقف کے اعتبار سے اپنے علاوہ بقیہ تمام مسلمانوں کو کافر قرار دے کر بحیثیت ایک جداگانہ اُمّت اپنا تشخص تین چوتھائی صدی قبل ہی طے کر لیا تھا۔ ان

حالات کی بنا پر ہر معقول اور انصاف پسند شخص اس نتیجہ پر بہ ادنیٰ تامل پہنچ جاتا ہے کہ قادیانیوں کو ایک جداگانہ غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا جائے۔ یہ انتہائی نرم، معقول اور ہلکا نیز ان کے حق میں مفید فیصلہ ہے۔ اگر یہاں فی الواقع دینی نظام نافذ ہوتا تو ان کو نئی نبوت کے اجراء اور اس کو ماننے کے جو نتائج بھگتنے پڑتے وہ ان کے لیے کہیں زیادہ سخت ہوتے۔ یہ تو لادینیت کا دور ہے اور ملک میں ابھی تک بالفعل انگریزی دور کا نظام معمولی حک و اضافہ کے ساتھ نافذ ہے، اسی لیے ان کے ساتھ انتہائی نرم سلوک کا مطالبہ ہے، ورنہ ان کے ساتھ معاملہ وہ ہوتا جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہوا۔ ان کو ارتداد کی ایسی سزاؤں سے واسطہ پڑتا جو خلافتِ راشدہ کے بعد بھی اسلامی سلطنت میں دی جاتی رہیں۔ یہ تو اکبرالٰہ آبادی کے بقول اس دور کی برکت ہے کہ ''انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ!'' کتنے ہی لغو اور مضحکہ خیز دعاوی کیے گئے، حتیٰ کہ نبوت کے قلعے میں بھی رخنہ ڈال دیا گیا اور نئی نبوت کے ٹھاٹھ بالفعل جما دیے گئے۔ اپنے علاوہ عالَمِ اسلام کے تمام مسلمانوں کو کافر قرار دے دیا، ان کے بچوں کی بھی تکفیر کر ڈالی لیکن نہ صرف یہ کہ ان کا کچھ نہ بگڑ سکا بلکہ وہ مسلمانوں میں شامل رہ کر تمام حقوق سے استفادہ بھی کرتے رہے۔ اپنے خالص سازشی کردار اور ''انجمن امدادِ باہمی'' کے طرز پر کام کرتے ہوئے اپنے جائز حقوق سے کہیں بڑھ کر سہولتیں اور مراعات حاصل کیں۔ بہرحال یہ نرم ترین اور انتہائی وسعت قلبی کا سلوک ہے جو اُمّتِ مُسلمہ ان کے ساتھ روا رکھنا چاہتی ہے، یعنی یہ کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر ان کے حقوق و فرائض متعین کر دیے جائیں اور ان کو ہمیشہ کے لیے جسدِ ملّت اسلامی سے علیحدہ کر دیا جائے۔''

ہمارے نزدیک قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیے جانے کا یہ فیصلہ ان ''معجزات'' کے سلسلے کی تازہ ترین اور اہم ترین کڑی ہے جن کی بنا پر ہمیں یہ یقین حاصل ہے کہ پاکستان کا قیام اسلام کے احیاء اور دینِ حق کے اس عالمی غلبے کی خدائی سکیم کا ایک اہم جزو ہے جس کی خبر مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دی تھی۔

تربیتِ اولاد: باپ کا کردار

راحیل گوہر صدیقی ☆

اس کائنات میں کوئی بھی انسان تمام فرائض اور افعال تنِ تنہا ادا نہیں کرسکتا' بلکہ ان کی تکمیل کے لیے معاشرے کی ضرورت پڑتی ہے۔ معاشرہ انسان کی طبعی ضرورت ہے' اس لیے ایک ذی عقل انسان معاشرے سے منقطع ہوکر زندگی بسر نہیں کرسکتا۔ جو لوگ غاروں' سنسان میدانوں یا جنگلوں میں زندگی بسر کرتے ہیں انہیں کوئی انسانی فضیلت حاصل نہیں ہوسکتی۔ اس حالت میں انسان کی تمام اخلاقی قوتیں مُردہ ہوجاتی ہیں۔ ان سے بھلائی یا برائی کچھ بھی سرزد نہیں ہوتی۔ انسان کی تخلیق کی غرض و غایت میں سے ایک نسلِ انسانی کو جاری رکھنا بھی ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً﴾ (النساء:۱)

''لوگو! اپنے ربّ کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک جان (آدمؑ) سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا' پھر ان دونوں سے کثرت سے مَرد و عورت (پیدا کرکے روئے زمین پر) پھیلا دیے۔''

انسان میں دو قوتیں ہیں۔ قوتِ عاقلہ کے ذریعے سے انسان علم و حکمت حاصل کرتا ہے' جبکہ قوتِ فاعلہ کو کام میں لاکر اپنے تمام معاملات میں تنظیم پیدا کرتا ہے۔ انسان کی سعادت ان دونوں قوتوں کی تکمیل کا نام ہے۔ پہلی کے ذریعے سے انسان صحیح فکر اور صحیح عقائد حاصل کرتا ہے اور اس پر تمام اسرارِ الٰہی منکشف ہوجاتے ہیں۔ دوسری قوت اسے اخلاقی کمال کے حصول میں مدد فراہم کرتی ہے۔ تمام قویٰ و ملکات اور افعال کی ترتیب سے اخلاقی کمال حاصل ہوتا ہے۔ یہ

☆ معاون مسئول' شعبۂ تصنیف و تالیف' قرآن اکیڈمی' لیسین آباد' کراچی

ترتیب اس طرح سے دی جاتی ہے کہ ایک قوت دوسری قوت پر غالب آجائے۔

فطری طبائع کے لحاظ سے لوگوں میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ قلیل تعداد ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو فطری طور پر نیک ہوتے ہیں' کبھی بد نہیں ہو سکتے' کیونکہ فطری چیز میں تغیّر واقع نہیں ہوتا۔ دوسری طرف بہت سے لوگ ایسے ہیں جو طبعاً بد ہیں اور کبھی نیک نہیں ہو سکتے۔ انسانوں کی ایک تیسری قسم ایسی ہے جو فطری طور پر نہ نیک ہوتے ہیں اور نہ بد' بلکہ تعلیم و تربیت اور صحبت کے اثرات سے نیکی یا بدی اختیار کر لیتے ہیں۔ انسان اگر فطری طور پر نیک اور صالح ہو تو اس کا وجود ایک سایہ دار گھنے درخت کی طرح ہوتا ہے جو مسافروں کو تپتی دھوپ میں اپنے ٹھنڈے اور فرحت بخش سائے کے ذریعے بدنی و قلبی راحت عطا کرتا ہے۔ ایسا ہی شخص ایک مشفق باپ' وفا شعار خاوند اور حساس دل رکھنے والا بھائی اور بیٹا ثابت ہوتا ہے۔ اس کی نیکیاں برگ و بار لاتی ہیں اور اس کا وجود کئی نسلوں کو اعلیٰ اخلاق و کردار کے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔

یہ دنیا حقوق و فرائض کے بندھن میں بندھی ہوئی ہے' جہاں کسی کے کچھ حقوق ہیں تو وہاں اس پر کچھ فرائض بھی عائد کیے گئے ہیں۔ یہ اسلام کے اخلاقی تقاضوں میں ایک اہم تقاضا ہے۔ اگر انسان کچھ فرائض ادا کرتا ہے تو وہ دوسروں سے امیدیں بھی وابستہ کر لیتا ہے۔ حقوق و فرائض کے کچھ پہلو تو ایسے ہیں کہ اگر ان میں توازن قائم نہ رکھا جائے تو معاشرہ کا حسن گہنا جاتا ہے۔ اسلام بدلے کے طرزِ عمل کو پسند نہیں کرتا۔ ''کچھ لو' کچھ دو'' (Give and take) دنیا کا اپنا وضع کردہ اصول ہے' جبکہ ایثار و قربانی کا اپنا ایک حسن ہے۔ اسلام کی اخلاقی تعلیم یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے ساتھ برا اور ناروا سلوک کرے تو اس کے جواب میں تم اس سے بہتر سلوک کرو۔ یہی ایک صالح انسان کی شناخت ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ﴿٣٤﴾﴾ (حٰمٓ السجدہ)

''اور بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی' تو (سخت کلامی کا) ایسے طریق سے جواب دو جو بہت اچھا ہو' (ایسا کرنے سے تم دیکھو گے) کہ جس میں اور تم میں دشمنی تھی وہ گویا تمہارا گرم جوش دوست ہے۔''

اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں والدین اور اولاد کے مابین حقوق و فرائض کا رشتہ بہت

حساس نوعیت کا ہے۔ یہ جذبات واحساس کے وہ آبگینے ہیں جو ذرا سی ٹھیس لگنے سے ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔ ان میں کسی قسم کی بھی غفلت اور کمی کوتاہی سے اللہ کی سخت ناراضگی کا احتمال ہوتا ہے۔ والدین کے حقوق پر تو اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں بہت زور دیا ہے۔ قرآن حکیم میں پانچ مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اپنے حق (شرک سے اجتناب) کے فوراً بعد والدین کے حقوق کا تذکرہ فرمایا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ﴿۱۴﴾﴾ (لقمٰن)

''ہم نے انسان کو اپنے والدین سے (حسنِ سلوک کا) تاکیدی حکم دیا ہے۔ اس کی ماں نے کمزوری سہتے ہوئے اسے اٹھائے رکھا اور دو سال اس کے دودھ چھڑانے میں لگے۔ چنانچہ میرا شکر ادا کرو اور اپنے والدین کا بھی، میرے پاس ہی لوٹ کر آنا ہے۔''

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾﴾ (الاسراء)

''آپ کے ربّ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اُس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔ اگر ان میں سے کوئی ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انہیں اُف تک نہ کہو نہ ہی انہیں جھڑکو، اور ان سے ادب سے بات کرو۔ اور انکساری اور نیاز مندی سے ان کے آگے جھکے رہو اور دعا کرتے رہو: اے میرے ربّ! ان پر رحم فرما جیسے انہوں نے بچپنے میں مجھے پالا تھا۔''

اللہ تعالیٰ نے والدین کو بھی اولاد کے حقوق اور ان کی تربیت کرنے کا پابند کیا ہے۔ انسانی معاملات اور ان کے باہمی تعلقات کے اسی حسن توازن نے اسلام کو دین فطرت بنا دیا ہے۔

والدین پر اولاد کا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ ان کی زندگی شروع ہونے سے پہلے ہی اس کو ختم کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ یہ نہ سوچا جائے کہ ان کا بوجھ ہم کیسے اٹھائیں گے اور انہیں پروان چڑھانے کے لیے مالی وسائل کہاں سے آئیں گے۔ ایک اور خباثت ابلیس دل میں ڈالتا

ہے کہ اولاد کا وجود ہماری آسائشیں اور پُرکشش زندگی کے لیے وبالِ جان بن جائے گا۔اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ خبردار کرتا ہے:

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ؕ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝٦﴾ (ھود)

''زمین پر چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو اور وہ اس کی قرارگاہ کو بھی جانتا ہے اور اس کے دفن ہونے کی جگہ کو بھی۔ یہ سب کچھ کتابِ واضح (لوحِ محفوظ) میں لکھا ہوا ہے۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((افْتَحُوا عَلَى صِبْيَانِكُمْ أَوَّلَ كَلِمَةٍ بِلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ .....))

(السلسلة الضعيفة:٦١٤٦)

''اپنے بچوں کو زبان کھولنے کے بعد سب سے پہلے کلمہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه سکھلاؤ.....''

ایک اور مقام پر محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((مَا نَحَلَ وَالِدٌ وَلَدًا مِنْ نُحْلٍ أَفْضَلَ مِنْ أَدَبٍ حَسَنٍ))

(سنن الترمذی: ١٩٥٢)

''کسی باپ نے اپنی اولاد کو کوئی عطیہ اور تحفہ حسنِ ادب سے بہتر نہیں دیا۔''

یعنی ایک باپ کا اپنی اولاد کے لیے سب سے اعلیٰ اور بیش بہا تحفہ یہ ہے کہ وہ اس کی تربیت اسلام کے بتائے ہوئے خطوط پر کرے۔اسلام امن وسلامتی کا دین ہے۔یہ عالمِ انسانیت کے لیے محبت، اخوت، رحمت، ایثار، قربانی اور عدلِ اجتماعی کا پیامبر بن کر آیا ہے۔قرآن حکیم میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ﴾ (التحریم:٦)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے، جس پر تند خو اور سخت مزاج فرشتے (مقرر) ہیں۔''

اس آیہ مبارکہ میں اہلِ ایمان کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ خود بھی اور اپنے گھر والوں کی بھی اصلاح کا خاص اہتمام کریں تاکہ وہ سب جہنم کا ایندھن بننے سے بچ جائیں۔امام زمخشری

رحمہ اللہ ''تفسیر کشاف'' میں لکھتے ہیں:

''قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ'' کا مطلب یہ ہے کہ معاصی ترک کر کے اور طاعات بجالا کر اپنے آپ کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ اور اپنے گھر والوں کو بھی اسی طرح آگ سے بچاؤ۔ اور جیسے تم اپنا مؤاخذہ اور محاسبہ کرتے ہو اسی طرح ان کا مؤاخذہ کیا کرو۔''

بچوں کی اصلاح و تربیت کی ذمہ داری اٹھانا والدین پر فرض ہے۔ ان کو اچھے کاموں کا عادی بنانا انتہائی ضروری ہے۔ یہی انبیاء و مرسلین علیہم السلام کا راستہ ہے۔ سیدنا نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو ایمان لانے کی دعوت دی اور امام الناس سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنی اولاد کو صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی کرنے کی وصیت کی۔ اس سلسلے میں سیدنا لقمان علیہ الرحمۃ کے طرزِ عمل کو قرآن حکیم میں سراہتے ہوئے تفصیلاً بیان کیا گیا ہے' جب وہ اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہے تھے:

﴿وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ⑬ ..... يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِيْ صَخْرَةٍ اَوْ فِي السَّمٰوٰتِ اَوْ فِي الْاَرْضِ يَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ ⑯ يٰبُنَيَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰي مَآ اَصَابَكَ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ⑰ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ⑱ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۭ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ ⑲﴾ (لقمٰن)

''ذرا یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: پیارے بیٹے! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانا' کیونکہ شرک بہت بڑا ظلم ہے..... اے میرے بیٹے! اگر (تیرا عمل) رائی کے دانے کے برابر بھی ہو' وہ خواہ کسی چٹان میں ہو یا آسمانوں میں ہو یا زمین میں' اللہ اسے نکال لائے گا۔ اللہ یقیناً باریک بین اور باخبر ہے۔ پیارے بیٹے! نماز قائم کر' نیکی کا حکم کر اور برے کام سے منع کر' اور اگر تجھے کوئی تکلیف پہنچے تو اس پر صبر کر۔ بلاشبہ یہ سب باتیں بڑی ہمت کے کام ہیں۔ اور (ازراہِ تکبر) لوگوں سے اپنے گال نہ پھلا اور نہ زمین پر اکڑ کے چل (کیونکہ) اللہ کسی خود پسند اور شیخی خورے کو پسند نہیں کرتا۔ اور اپنی چال میں اعتدال کو ملحوظ رکھو' اور اپنی آواز پست کرو' بلاشبہ سب آوازوں سے بری آواز گدھے کی آواز ہے۔''

یہ ایک باپ کا اپنے بیٹے کے لیے وعظ و نصیحت اور علم و حکمت کو وہ خزانہ ہے جس پر عمل پیرا ہو کر نہ صرف اولاد دنیا اور آخرت کی تمام بھلائیوں سے فیض یاب ہو سکتی ہے بلکہ اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی بھی حاصل کر سکتی ہے۔ ایسی نیک اور صالح اولاد اپنے ماں باپ کے لیے اس دنیا میں آنکھوں کی ٹھنڈک اور آخرت میں ان کی مغفرت اور نجات کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ قرآن حکیم میں اسی حوالے سے دعا بتائی گئی ہے: ارشاد ہوا:

﴿وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا﴾ (الفرقان)

''اور جو (اللہ سے) دعا مانگتے ہیں کہ: اے ہمارے رب! ہم کو ہماری بیویوں کی طرف سے (دل کا چین) اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا۔''

رسولِ مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تربیتِ اولاد کے بنیادی اصول بتائے کہ:

((مُرُوا أَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ أَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِينَ، وَاضْرِبُوهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ أَبْنَاءُ عَشْرٍ ، وَفَرِّقُوا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ)) (سنن أبي داود: ۴۹۵)

''جب تمہارے بچے سات سال کی عمر کو پہنچ جائیں تو انہیں نماز کی تلقین کرو، اور دس سال کی عمر کے بچوں میں اس حوالے سے سستی دیکھو تو انہیں سرزنش کرو، اور ان کے بستر الگ کر دو۔''

اسلام دین فطرت ہے۔ جب وہ کسی برائی کو روکنا چاہتا ہے تو اس طرف جانے والے راستوں پر قدغنیں لگا دیتا ہے۔ زنا جیسے کبیرہ گناہ سے بچنے کے لیے پردے کا حکم، مخلوط محفلوں میں شرکت پر پابندی، فحاشی اور عریانی کی مذمت کی گئی۔ اسی طرح بچے کے رحمِ مادر میں آنے سے پہلے ہی اس کی شخصیت کو ایک صالح انسان بننے کا سبب بھی پیدا فرما دیا گیا۔ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((إذا أتَى أحَدُكُم أهْلَهُ فَلْيَقُلْ: اَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا (متفق عليه)

''جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی کے پاس جانے کا ارادہ کرے تو یہ دعا کرے کہ: اے اللہ! ہم دونوں کو شیطان (کے شر) سے محفوظ رکھنا اور ہماری اس اولاد سے بھی شیطان کو

دور رکھنا جو تو ہمیں عطا فرمائے۔‘‘

امام غزالی رحمہ اللہ اپنے رسالے ’’أَيُّهَا الوَلَد ‘‘میں لکھتے ہیں:

’’تربیت کا مفہوم اس کاشت کار کے کام سے مشابہت رکھتا ہے جو زمین سے کانٹے نکالتا ہے اور کھیت میں سے ناموزوں گھاس وغیرہ اکھاڑ ڈالتا ہے تاکہ اس کی پیداوار اچھی ہو اور مکمل طور پر ہو۔‘‘

ایک بار سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے عرب کے مشہور سردار احنف بن قیس کو اپنے پاس بلوایا اور ان سے دریافت کیا: ’’ابو بحر! اولاد کے ساتھ سلوک کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ احنف بن قیس نے کہا: ’’اولاد ہماری دلی آرزوؤں کا ثمرہ اور کمر کی ٹیک ہے۔ ہم اِس کے لیے اس زمین کی طرح ہیں جو نہایت ہی نرم اور بالکل بے ضرر ہے۔ ہمارا وجود اولاد کے لیے اُس آسمان کی طرح ہے جو اس پر سایہ کیے ہوئے ہے۔ ہم اسی کے سہارے بڑے بڑے کارنامے انجام دینے کی ہمت کرتے ہیں۔ لہٰذا اولاد اگر آپ سے کوئی مطالبہ کرے تو خوش دلی کے ساتھ اسے پورا کیجیے۔ اگر وہ غمزدہ ہو تو اس کے دل کا غم دور کیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ آپ سے محبت کرے گی‘ آپ کی پدرانہ کوشش کو پسند کرے گی۔ آپ کبھی اس کے لیے ناگوار اور ناقابلِ برداشت بوجھ نہ بنیے کہ وہ آپ کی زندگی سے اکتا جائے‘ آپ کی موت چاہنے لگے اور آپ کے قریب آنے سے نفرت کرنے لگے۔‘‘

اپنی اولاد کو پاکیزہ خیالات‘ تعمیری عادات و اطوار‘ مثبت عقائد و افکار اور صالح سیرت سے آراستہ کرنا ایک مسلمان باپ کی ذمہ داری ہے۔ اگرچہ ماں کی گود کو اولاد کے لیے پہلا مدرسہ قرار دیا گیا ہے‘ مگر بعض معاملات میں ماں مجبور و بے بس ہو جاتی ہے۔ زندگی کے اکثر معاملات میں حتمی اور آخری فیصلہ مَردوں ہی کا ہوتا ہے۔ بعض گھرانوں میں ماں بچے کو کسی رنگ میں ڈھالنا چاہتی ہے جبکہ باپ اسے کسی اور ہی روپ میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اس طرزِ عمل کا ایک تشویش ناک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ بچے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ شک‘ تذبذب اور تردّد ان کے مزاج کا حصّہ بن جاتا ہے۔ وہ لوگوں کے ہجوم میں رہ کر بھی خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔

بچہ ماں باپ کے پاس ایک امانت ہے۔ اس کا سادہ و صاف دل ہر نقش کو قبول کرتا ہے۔ اگر اسے نیکی کی عادت ڈالی جائے تو اس کی نشوونما اس پر ہو گی جبکہ اگر اسے برائی کی عادت ڈال

دی جائے تو وہ اسی میں بڑھتا چلا جائے گا۔ ایک سمجھ دار باپ کا یہ اہم فریضہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کو بری گفتگو، بری لوگوں کی مجلس سے دور رکھے، کیونکہ صحبت اپنا اثر ضرور دکھاتی ہے۔ اچھی صحبت، پاکیزہ ماحول اور دین داری کا راستہ بچے کی ذہنی نشوونما کا ضامن ہوتا ہے جبکہ برے صحبت اس کے کردار و عمل اور آئندہ زندگی کو گمراہی کی دلدل میں پھنسا دیتی ہے۔ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے باپ کی ذمہ داری کو بڑے پُرزور اور تاکیدی انداز میں بیان فرمایا ہے:

''اہلِ علم کہتے ہیں کہ قیامت کے روز والد سے اس کی اولاد کے متعلق باز پرس ہوگی، کیونکہ جس طرح باپ کا اپنے بیٹے پر حق ہے اسی طرح بیٹے کا باپ پر حق ہے۔''

نبی رحمت ﷺ کا ارشاد ہے:

((ما مِن مَوْلُودٍ إلَّا يُولَدُ علَى الفِطْرَةِ، فأبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ، أوْ يُنَصِّرَانِهِ، أوْ يُمَجِّسَانِهِ)) (متفق عليه)

''ہر بچہ فطرتِ سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی اور مجوسی بنا دیتے ہیں۔''

گویا ہر بچہ پیدائشی طور پر مسلمان ہوتا ہے۔ پھر اس کے والدین اس کی شخصیت کی تشکیل و تعمیر کرتے ہیں اور وہ جس رنگ میں چاہیں اسے ڈھال دیتے ہیں۔

ہماری قوم کا المیہ یہ ہے کہ والدین کا بچوں کی عصری تعلیم پر جتنا زور ہوتا ہے اور اس معاملے میں وہ جتنی حساسیت کا مظاہرہ کرتے ہیں، اس کا چوتھائی حصہ بھی بچوں کی بہتر تربیت پر نہیں ہوتا۔ اعلیٰ تعلیم دلانے کے پیچھے یہ مقصد کارفرما ہوتا ہے کہ اولاد کو بہترین ملازمت ملے اور اس کا معیارِ زندگی جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوجائے۔ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانا کوئی معیوب بات نہیں، لیکن مقصد محض دنیا اور اس کی لذتوں کا حصول نہ ہو۔ یہ دنیا اور اس کے تمام وسائل زندگی گزارنے کے ذرائع ہیں جو قدرت نے ہمیں عطا کیے ہیں، لیکن ان ہی میں دل لگا کر بیٹھ جانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ بقول اکبر الٰہ آبادی:

دُنیا میں ہوں، دُنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں، خریدار نہیں ہوں!

تربیتِ اولاد میں باپ کا کردار کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ جب تک وہ اپنی اولاد کی قرآن و

سُنّت کی تعلیمات کے مطابق تربیت نہیں کرے گا' اس کا بچہ نہ اچھا باپ بن سکتا ہے' نہ اچھا بھائی' نہ اچھا بیٹا اور نہ اچھا شوہر۔ اسی طرح کوئی عورت کسی بھی روپ میں ہو' وہ نیکی کے راستے پر نہیں چل سکتی جب تک ہدایت کی روشنی اس کی زندگی میں نہ آجائے۔ دولت' تعلیم' طاقت' ذہانت' علمی اور فنی صلاحیت کچھ بھی نعمت نہیں کہلا سکتی جب تک اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ہدایت تامہ اسے حاصل نہ ہو۔ خالق کائنات کی ہدایت اور رہنمائی انسان کے ساتھ نہ ہو تو بسا اوقات بڑے سے بڑا علم اس کی بدبختی اور خسارے کا موجب بن جاتا ہے۔ جب محض دنیا ہی پیش نظر ہو اور اللہ کا دین نظروں سے اوجھل رہے تو انسان کی دنیوی کامیابی بھی اس کے لیے آخرت میں وبالِ جان بن جائے گی۔

ہمارے معاشرے میں اکثریت ایسے والدین کی ہے جو سوچتے ہیں کہ دنیا میں وہ خود جن آسائشوں' مادی لذتوں اور اکل وشرب کی حلاوتوں سے محروم رہے' ان کا بچہ ان چیزوں سے تہی دست نہ رہ جائے۔ اس دیرینہ خواہش کی تکمیل میں بعض اوقات ان سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں بھی سرزد ہوتی ہیں۔ شیطان دنیا کی لذتوں کو انسان کی نظروں میں مزین کر کے دکھاتا ہے۔ یوں انسان اس فانی دنیا کی بھول بھلیوں ہی میں بھٹکتا رہتا ہے۔ والدین کی سعادت اور نیک بختی یہ ہے کہ وہ اولاد کی مثالی تربیت کریں۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

((أَكْرِمُوا أَوْلَادَكُمْ وَ أَحْسِنُوا أَدَبَهُمْ)) (سنن ابن ماجه: ۳۶۷۱)

''اپنی اولاد کو عزت دو اور ان کی اچھی تربیت کرو۔''

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اپنی تصنیف ''اخلاق اور فلسفہ اخلاق'' میں رقم طراز ہیں:

''وہ باپ یقیناً خطا کار ہے جو پہلے ہی یہ طے کر لے کہ میرا بیٹا عنقریب طبیب یا مہندس یا قاضی بنے گا اور پھر اس کو مقرر کردہ محدود راہ پر چلنے کے لیے مجبور کرے۔ اس لیے کہ بسا اوقات اُس میں طب' ہندسہ یا قانون کی استعداد نہیں ہوتی۔ مگر وہ باپ صواب پر ہے جو اپنے بیٹے کے لیے یہ طے کر لے کہ وہ اس کو امین' شجاع اور صاحب فضل بنائے گا۔ اس لیے کہ وہ ابھی لڑکا ہے اور اس میں کسی نہ کسی حد تک ان اخلاقِ فاضلہ کی استعداد موجود ہے۔ صحیح تربیت کے ذریعے سے نفسیات مبادیات اور ان کے قوانین کی معرفت و تعلیم پر انسان کی قدرت ہو سکتی ہے۔''

اسلام اوائل عمری ہی سے بچوں کو اسلامی امور سکھانے کی تاکید کرتا ہے تاکہ جب وہ

باشعور ہو جائیں تو ان کے دل میں خوفِ خدا پیدا ہو چکا ہو۔ اپنے معبودِ حقیقی کی عبادت' اپنے رسول ﷺ کی اطاعت کا ذوق وشوق اپنے دل میں رکھتے ہوں۔ باپ اگر اپنے بچے کی تربیت اسلامی خطوط پر کرتا ہے تو بچے کے اندر اللہ کی خشیت اور اطاعت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ صالح زندگی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ باپ کی یہ نیکی اجر وثواب کے لحاظ سے دائمی نیکی بن جاتی ہے۔ رسول مکرم ﷺ نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

((إِذَا مَاتَ الإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ: إِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ)) (صحیح مسلم: ۱۶۳۱)

''جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے' مگر اس کے تین عمل باقی رہتے ہیں: ایک صدقۂ جاریہ' دوم وہ علم جس سے استفادہ کیا جا رہا ہو اور سوم وہ نیک اولاد جو اس کے لیے دعا کرتی ہو۔''

مذکورہ قرآنی آیات اور فرموداتِ رسول ﷺ کی روشنی میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ بچے کی بہترین تربیت کرنے کی تمام تر ذمہ داری والدین پر ہے' خاص طور پر اس فکری اور عملی جِدّوجُہد میں باپ کا کردار انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ باپ خاندان کا سربراہ ہے۔ انسانی معاملات میں اس کا فیصلہ حتمی مانا جاتا ہے' کہیں زور زبردستی سے' کہیں رضامندی سے تو کبھی مصلحتاً! اس لیے دیکھا جائے گا کہ اس نے اپنی اولاد کو دنیا سمیٹنے کے داؤ پیچ سکھائے یا اس کے اندر دین داری اور خشیتِ الٰہی کے لیے بھی کوئی سعی وجُہد کی۔

ارشادِ ربّ العزت ہے:

﴿فَإِذَا جَاءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿٣٣﴾ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ﴿٣٤﴾ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ﴿٣٥﴾ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ﴿٣٦﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُّغْنِيهِ ﴿٣٧﴾﴾ (عبس)

''تو جب کان بہرے کر دینے والی (قیامت) آجائے گی' اس دن آدمی اپنے بھائی سے دور بھاگے گا اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے' اور اپنی بیوی اور بیٹے سے۔ ان میں سے ہر شخص کو اُس روز ایک ہی فکر لاحق ہوگی جو اُسے (ہر ایک سے) بے پروا کر دے گی۔''

فاعتبروا يا أولى الأبصار!

❁❁❁

گھر: ہماری دعوت کا اوّلین میدان

شعبہ تعلیم وتربیت

گھر انسانی معاشرہ کی بنیادی اکائی ہے۔ بہت سے گھر مل کر ایک محلہ بناتے ہیں۔ پھر بہت سے محلے مل کر گاؤں اور قصبہ کی بنیاد رکھتے ہیں۔ اسی طرح شہر‘ ملک اور خطے وجود میں آتے ہیں۔ چنانچہ اگر ہر گھر درست ہو جائے تو معاشرہ درست ہو سکتا ہے۔

دنیا میں انسان کے لیے سب سے زیادہ سکون کی جگہ گھر ہی ہوتا ہے۔ یہاں ایک ساتھ رہنے والے لوگ ایک دوسرے کے لیے قرب اور محبت رکھتے ہیں۔ والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی اولاد کا مستقبل سنور جائے‘ انہیں اپنی آئندہ زندگی میں کوئی تکلیف نہ ہو۔ تقریباً تمام والدین ہی اپنی سمجھ اور ترجیحات کے مطابق اپنے گھر کی اصلاح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ کے نزدیک سماجی رویے بہت اہم ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کے نزدیک مال و دولت کی اہمیت ہوتی ہے‘ وہ اپنی اولاد کو مال کمانے کے گُر سکھاتے ہیں۔ مقتدر طبقات کے لوگ اپنی اولاد کو حکمرانی کے طور طریق اور سیاست سکھاتے ہیں۔ تاہم عام لوگوں کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ ان کی اولاد تعلیم حاصل کرے‘ پڑھ لکھ کر ایک اچھی نوکری یا اعلیٰ کاروبار کرے۔ مادّی طور پر سبھی والدین اپنی اولاد کی ضروریات پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اپنی اولاد کو اچھا کھلائیں‘ اچھا پہنائیں اور اچھی جگہ ان کی شادی کریں۔

سربراہِ خاندان کی اس سے بڑھ کر بھی ایک بہت اہم ذمہ داری ہے جس کی طرف عموماً توجہ نہیں دی جاتی۔ وہ ہے اپنے اہل و عیال کی آخرت کی کامیابی اور فوز و فلاح کی فکر کرنا تاکہ وہ جنت میں اعلیٰ مقام حاصل کر سکیں اور جہنم کے ابدی عذاب سے بچ جائیں۔ سورۃ التحریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا قُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ وَاَهۡلِیۡكُمۡ نَارًا وَّقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ

عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝﴾

''اے اہلِ ایمان! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو اُس آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر' اس پر بڑے تند خو' بہت سخت دل فرشتے مامور ہیں' اللہ ان کو جو حکم دے گا وہ (فرشتے) اس کی نافرمانی نہیں کریں گے اور وہ وہی کریں گے جس کا انہیں حکم دیا جائے گا۔''

اس آیت کی تشریح میں بانیٔ محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''آیت زیر مطالعہ میں اہلِ ایمان کو ان کے اہل وعیال کے بارے میں خبردار کیا جا رہا ہے کہ بحیثیت شوہر اپنی بیویوں کو اور بحیثیت باپ اپنی اولاد کو دین کے راستے پر ڈالنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ یہ مت سمجھو کہ ان کے حوالہ سے تمہاری ذمہ داری صرف ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کی حد تک ہے' بلکہ ایک مومن کی حیثیت سے اپنے اہل وعیال کے حوالہ سے تمہارا پہلا فرض یہ ہے کہ تم انہیں جہنم کی آگ سے بچانے کی فکر کرو۔ اس کے لیے ہر وہ طریقہ اختیار کرنے کی کوشش کرو جس سے ان کے قلوب و اذہان میں دین کی سمجھ بوجھ' اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اور آخرت کی فکر پیدا ہو جائے تاکہ تمہارے ساتھ ساتھ وہ بھی اس جہنم کی آگ سے بچ جائیں۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ جہنم پر مامور فرشتے مجرموں کو جہنم میں جلتا دیکھ کر ان پر رحم نہیں کھائیں گے اور نہ ہی ان کے نالہ وشیون سے متاثر ہوں گے۔ تو کیا ہم ناز ونعم میں پلے اپنے لاڈلوں کو جہنم کا ایندھن بننے کے لیے ان سخت دل فرشتوں کے سپرد کرنا چاہتے ہیں؟ ہم میں سے ہر ایک کو اس زاویہ سے اپنی ترجیحات کا سنجیدگی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ کیا ہم اپنے اہل و عیال کو جنت کی طرف لے جا رہے ہیں یا جہنم کا راستہ دکھا رہے ہیں؟

اپنے بہترین وسائل خرچ کر کے اپنی اولاد کو جو تعلیم ہم دلوا رہے ہیں' کیا وہ ان کو دین کی طرف راغب کرنے والی ہے یا ان کے دلوں میں بغاوت کے بیج بونے والی ہے؟ اگر تو ہم اپنے اہل وعیال کو اچھے مسلمان بنانے کی کوشش نہیں کر رہے اور ان کے لیے ایسی تعلیم وتربیت کا اہتمام نہیں کر رہے جو انہیں دین کی طرف راغب کرنے اور فکرِ آخرت سے آشنا کرنے کا باعث بنے تو ہمیں جان لینا چاہیے کہ ہم محبت کے نام پر ان سے عداوت کر رہے ہیں۔'' (بیان القرآن' جلد چہارم' صفحہ ۵۰۸)

آیئے احادیث نبویہ ﷺ کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں کہ بچوں کی تعلیم وتربیت کی کیا اہمیت ہے اور اس کے لیے کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:

''اپنے بچوں کی زبان سے سب سے پہلے لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه کہلواؤ اور موت کے وقت ان کو اسی کلمہ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه کی تلقین کرو۔'' (شعب الایمان للبیہقی)

انسانی ذہن کے بارے میں جدید تجربات اور تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ پیدائش ہی کے وقت سے بچے کے ذہن میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ جو آوازیں وہ کان سے سنے اور آنکھوں سے جو کچھ دیکھے، اس سے اثر لے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے بچے کی پیدائش کے فوراً بعد اس کے دائیں کان میں اذان کہنے کی تلقین فرمائی۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مُرُوا أولادَكُمْ بِالصَّلاةِ وهُم أبناءُ سَبْعِ سِنِينَ، وَاضْرِبُوهُم عَلَيها وَهُمْ أبْنَاءُ عَشْرٍ ، وَفَرِّقُوا بَينَهم في المَضَاجِعِ)) (سنن أبي داود)

''تمہارے بچے جب سات سال کے ہو جائیں تو ان کو نماز کی تلقین کرو۔ اور جب وہ دس سال کے ہو جائیں تو نماز میں کوتاہی پر ان کو سزا دو اور ان کے بستر بھی الگ کر دو۔''

بچے سات سال کی عمر میں سمجھ دار اور باشعور ہو جاتے ہیں۔ اس عمر میں ان کو خدا پرستی کے راستے پر ڈالنا چاہیے اور اس کے لیے ان سے نماز کی پابندی کرانی چاہیے۔ دس سال کی عمر میں ان کا شعور کافی ترقی کر جاتا ہے اور ان کے بلوغ کا زمانہ بھی قریب آ جاتا ہے۔ اس وقت نماز کے بارے میں ان پر سختی کرنی چاہیے اور اگر وہ کوتاہی کریں تو مناسب طور پر ان کی سرزنش بھی کرنی چاہیے۔

انبیاء کرام علیہم السلام نے بھی دعوت وتبلیغ کے لیے یہی طریق کار اختیار کیا۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے اپنے والد آزر کو دین کی دعوت دی، جس کا تذکرہ سورۃ مریم میں موجود ہے۔

﴿إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا ﴿٤٢﴾ يَا أَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿٤٣﴾ يَا أَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطَانَ ۖ إِنَّ الشَّيْطَانَ كَانَ لِلرَّحْمَٰنِ عَصِيًّا ﴿٤٤﴾ يَا أَبَتِ إِنِّي أَخَافُ أَنْ يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِنَ الرَّحْمَٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطَانِ وَلِيًّا ﴿٤٥﴾﴾

''یاد کیجیے جب ابراہیم نے اپنے والد سے کہا: ابا جان! آپ کیوں بندگی کرتے ہیں ایسی

چیزوں کی جو نہ سن سکتی ہیں اور نہ دیکھ سکتی ہیں اور نہ ہی آپ کے کچھ کام آ سکتی ہیں۔ ابا جان! یقیناً میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا' پس آپ میری پیروی کیجیے' مَیں آپ کو دکھاؤں گا سیدھا راستہ۔ ابا جان! آپ شیطان کی بندگی نہ کیجیے' شیطان یقیناً رحمٰن کا نافرمان تھا۔ ابا جان! مجھے اندیشہ ہے کہ رحمٰن کی طرف سے کوئی عذاب آپ کو آ پکڑے اور پھر آپ شیطان ہی کے ساتھی بن کر رہ جائیں۔''

''یٰۤاَبَتِ'' کی تکرار سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام انتہائی محبت اور دل سوزی کے ساتھ باپ کو سمجھا رہے ہیں کہ آپ شیطان کی بندگی مت کیجیے اور میری پیروی کیجیے' میں آپ کو سیدھا راستہ دکھاؤں گا۔ آخرت کے برے انجام سے بھی خبردار کرتے ہیں۔ اپنے والد اور اولاد کے لیے اللہ تعالیٰ سے نماز کا عادی بنانے' بالفاظ دیگر سیدھے راستہ پر چلانے کی دعا کرتے ہیں۔ اپنے والدین کے لیے استغفار کی دعا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ تمام باتیں ہماری رہنمائی کے لیے درج کی ہیں کہ اپنے اہل وعیال' والدین سے محبت کا اولین تقاضا یہ ہے کہ انہیں سیدھے راستے پر چلانے کی کوشش کی جائے اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کی جائے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت میں بھی ہمیں یہی انداز نظر آتا ہے۔ سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اہلیہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا' غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ' چچازاد بھائی حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور جگری دوست حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ شامل ہیں۔

اہل خانہ کی تربیت بہت شفقت اور ہمدردی کے ساتھ کرنی چاہیے۔ کبھی کبھی تادیب کے لیے سختی بھی ضروری ہوتی ہے' مگر اس سختی کا استعمال بھی حکمت کے ساتھ ہونا چاہیے۔ حد سے زیادہ مار پیٹ کے نتائج الٹ نکلتے ہیں کہ بچے تعلیم ہی سے متنفّر ہو جاتے ہیں۔ اس ضمن میں اردو کی یہ ضرب المثل ذہن میں رہنی چاہیے کہ: ''کھلائے سونے کا نوالہ' دیکھے شیر کی نظر۔''

اہل وعیال کی محبت حدِّ اعتدال سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ سورۃ التغابن میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَ اِنْ تَعْفُوْا وَ تَصْفَحُوْا وَ تَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴﴾﴾

''اے ایمان کے دعوے دارو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے

دشمن ہیں‘ سوان سے بچ کر رہو۔ اور اگر تم معاف کر دیا کرو اور چشم پوشی سے کام لو اور بخش دیا کرو تو اللہ بہت بخشنے والا‘ نہایت مہربان ہے۔‘‘

آج ہمارے معاشرے کے روایتی مسلمانوں کو تو بیوی‘ بچوں کی دشمنی والی بات سمجھ میں ہی نہیں آئے گی۔ البتہ اگر کوئی بندۂ مومن اللہ تعالیٰ کی توفیق سے کسی انقلابی تحریک کے کارکن کی حیثیت سے اقامتِ دین کی جدّ و جُہد میں مصروف ہو تو اس پر یہ حقیقت بہت جلد واضح ہو جاتی ہے کہ اس راستے میں بیوی بچوں کی محبت کس طرح پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے۔ بیوی کی بے جا فرمائشیں‘ بچوں کی حد سے بڑھی ہوئی ضروریات‘ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں ان کی تعلیم کے اخراجات اگر حلال کی کمائی سے پورے نہیں ہوں گی تو انسان کیا کرے گا۔ یا تو حرام میں منہ مارے گا یا ڈالر کمانے ملک سے باہر جائے گا۔ دونوں صورتوں میں بچوں کی اسلامی خطوط پر تربیت نہ ہو سکے گی اور ان کی آخرت برباد ہو کر رہ جائے گی۔

یہ معاملہ چونکہ بہت نازک اور حساس ہے‘ اس لیے اگلے جملے میں یہ تلقین کی جا رہی ہے کہ اپنے موقف پر قائم رہتے ہوئے اپنے اہل و عیال کے معاملات کو نرمی اور حکمت سے نمٹاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ صبح و شام تمہارا گھر میدانِ جنگ کا نقشہ پیش کرنے لگے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے‘ انہوں نے کہا کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْؤُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ)) (متفق عليه)

’’تم میں سے ہر آدمی نگہبان ہے اور ہر آدمی اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے۔‘‘

اس حدیث مبارکہ کے مطابق ہم اپنے اہل خانہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے ہاں جواب دہ ہیں کہ ان کے ضمن میں ہم نے اپنی ذمہ داری نبھائی یا نہیں۔ اسی ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے تنظیم اسلامی کے ملتزم رفقاء کے لیے یہ لازم کیا گیا ہے کہ وہ اپنے اہل و عیال اور اپنے زیر کفالت افراد کی تربیت کے لیے ایک ’’گھریلو اُسرہ‘‘ کا قیام عمل میں لائیں۔ مبتدی رفقاء اور احباب کو چاہیے کہ وہ بھی اپنے اہل خانہ کی تربیت کے لیے ’’گھریلو اُسرہ‘‘ ضرور قائم کریں۔ سربراہِ خاندان خود اس اسرہ کا منتظم ہو اور خاتونِ خانہ اس کام میں شوہر کی معاونت کریں۔ بہتر ہوگا کہ یہ مجلس ہفتہ وار منعقد کی جائے اور اس کا دورانیہ کم از کم ایک گھنٹہ ہو۔

اسرہ کا نصاب ذیل میں تجویز کیا جا رہا ہے‘ جس کی ذمہ داری گھرانہ کے مختلف افراد مل جل کر نبھائیں:

۱) تلاوت اور ترجمہ قرآن

۲) آدابِ زندگی (محمد یوسف اصلاحی) سے بنیادی اخلاقیات کا مطالعہ

۳) سیرۃ النبی ﷺ (ترجیحاً الرحیق المختوم) کا سلسلہ وار مطالعہ

۴) سیرتِ صحابہ/صحابیات رضی اللہ عنہم کا مطالعہ

۵) مشہور دینی شخصیات کے دل افروز واقعات

عمر کے مختلف ادوار میں تعلیم و تربیت کا انداز تبدیل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ دس سال کی عمر تک پیار محبت سے‘ اس کے بعد ہلکی پھلکی سختی اور پھر جوانی کے دور میں صرف دلائل اور محبت کے ساتھ بات سمجھانی چاہیے۔

دورِ حاضر میں سکول‘ کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم نہ صرف سیکولر ہے بلکہ دین سے دور کرنے والی بھی ہے۔ یہ ایمان میں شکوک پیدا کرتی ہے۔ اس کائنات کے علم کو ہی اصل علم قرار دیتی ہے۔ طبیعیات کے قوانین کو حتمی قرار دیتی ہے۔ تعلیم کا پورا زور جسم‘ کائنات اور حیات دنیوی کی طرف ہے۔ اللہ‘ روح اور حیاتِ اُخروی کی طرف بالکل توجہ نہیں۔ ان حالات میں تو اب ہماری ذمہ داری اور زیادہ بڑھ گئی ہے کہ گھر پر بچوں کی دینی تعلیم کا بندوبست کریں اور مروّجہ تعلیمی اداروں کی پھیلائی ہوئی گمراہی اور مغالطوں کو دور کرنے کی فکر کریں۔ اس کے ساتھ خود بھی دین کو قائم کرنے کی جدّوجُہد میں حصہ لیں اور اس میں اپنے اہل وعیال کو بھی شریک کریں‘ تاکہ غلبۂ دین کی راہ ہموار ہو سکے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے اہل وعیال کی تربیت کے ضمن میں ہماری مدد فرمائے۔ ہمارے والدین اور ہمارے اہل وعیال سمیت تمام مومنین کی مغفرت فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین! ۞۞۞

میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت اور فضیلت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اللہ تعالیٰ کائنات کا نہ صرف خالق ہے بلکہ مخلوق کے ہر فرد کا رازق بھی ہے۔ کائنات میں مخلوق کی لاتعداد انواع ہیں۔ انسان ایک باشعور مخلوق ہے۔ ہم اگرچہ خود محنت کر کے خود روزی کماتے ہیں تاہم اس سلسلہ میں یہ پابندی عائد کی گئی ہے کہ ہم جائز طریقے اور ذریعے استعمال میں لائیں۔ روزی رساں اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے روزی وافر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے تھوڑی مقدار میں دیتا ہے۔

دوسرے حیوانات کے برعکس' انسان مرنے کے بعد غیر مسئول نہیں۔ اس سے پوچھا جائے گا کہ اُس نے خالق کی ہدایات کے مطابق محنت کر کے روزی کمائی یا اس مقصد کے لیے ناجائز ذرائع استعمال کیے۔ یہ بھی پوچھا جائے گا کہ جو روزی اس نے کمائی' اسے جائز کاموں میں خرچ کیا یا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے کاموں میں ضائع کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان پر لازم کیا ہے کہ وہ اپنی کمائی میں سے غریب' محتاج اور فقیر لوگوں کی مدد کرے۔ اس سلسلہ میں زکوٰۃ کا ادا کرنا تو فرض کیا گیا ہے' تاہم اس کے علاوہ بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ مسلمانوں کو مال جمع کرنے سے روکا گیا ہے تاکہ دولت صرف اہل ثروت کے درمیان ہی گردش میں نہ رہے۔ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝۱۹﴾ (الذّٰریٰت) یعنی مال داروں کے اموال میں غریبوں کا حق ہے خواہ وہ مانگتے ہیں یا نہیں مانگتے۔ اس طرح سے خرچ کیے گئے مال کو اللہ تعالیٰ اپنے ذمہ قرض گردانتا ہے جس کے بدلے میں آخرت میں اجرِ عظیم ملے گا۔

نماز کی طرح زکوٰۃ بھی ارکانِ اسلام میں سے ہے' جو ہر صاحبِ نصاب پر ہر سال ادا کرنا فرض ہے۔ سال بھر میں کل جمع شدہ مال پر زکوٰۃ کی شرح اڑھائی فیصد ہے۔ قرآن مجید میں بار

بار اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ روزی زیادہ دینا یا کم دینا اللہ تعالیٰ کا اختیار اور اس کی مرضی ہے، جس کسی کو جو مال ملا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کا عطا کردہ ہے۔ اس مال میں سے ایک سال کے بعد چالیسواں حصہ غریب اور محتاج لوگوں میں تقسیم کر دینا کوئی مشکل نہیں۔ جو کوئی اس کو بھی مشکل سمجھتا ہو اور ادا نہ کرتا ہو اس کو سخت عذاب کی وعید ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝﴾ (التوبۃ)

''جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے ان کو اُس دن کے عذابِ الیم کی خبر سنا دو۔ جس دن وہ مال دوزخ کی آگ میں خوب گرم کیا جائے گا، پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی (اور کہا جائے گا) یہ وہی ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا، سو جو تم جمع کرتے تھے (اب) اس کا مزا چکھو۔''

یہ تو حکم ہے زکوٰۃ کی ادائیگی کا۔ اس عذاب کا مستحق وہ شخص ہے جس نے اپنے مال کی زکوٰۃ بھی ادا نہیں کی۔ یہی مال آخرت میں اس کے لیے عذاب بن جائے گا۔ اپنی وفات کے وقت وہ شخص پچھتائے گا اور کہے گا کہ کاش مجھے کچھ مہلت مل جائے تو میں اپنا مال صدقہ کر دوں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَاۗءَ اَجَلُهَا ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝﴾ (المنفقون)

''اور جو (مال) ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے اُس وقت سے پہلے خرچ کر لو کہ تم میں سے کسی کو موت آ جائے تو (اس وقت) وہ کہنے لگے: اے میرے پروردگار! تو نے مجھے تھوڑی سی اور مہلت کیوں نہ دی تاکہ میں خیرات کر لیتا اور نیک لوگوں میں داخل ہو جاتا۔ اور جب کسی کی موت آ جاتی ہے تو اللہ اس کو ہرگز مہلت نہیں دیتا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔''

ظاہر ہے کہ جب مہلتِ عمر ختم ہو جائے گی تو اس کو ایک لمحہ کی بھی extension نہیں ملے گی اور اس وقت کا پچھتاوا کسی کام نہ آئے گا۔ زکوٰۃ کے علاوہ اپنا مال اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ضرورت مندوں اور مسکینوں پر خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اِنَّ فِی الْمَالِ لَحَقًّا سِوَی الزَّکَاۃِ)) (سنن الترمذی: ۶۵۹) ''یقیناً مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی (اللہ کا) حق ہے۔'' پھر آپ ﷺ نے سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۷ تلاوت فرمائی، جس میں (زکوٰۃ کے علاوہ) قریبی رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوالیوں اور گردن چھڑانے میں مال خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر فرض زکوٰۃ کے علاوہ انفاقِ مال کی ترغیب ملتی ہے۔

﴿یَسْـَٔلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ط قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ فَلِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ط وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَیْرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیْمٌ ﴿۲۱۵﴾﴾ (البقرۃ)

''(اے نبی ﷺ!) یہ آپ سے پوچھتے ہیں کیا چیز خرچ کریں؟ کہہ دو کہ جو کچھ تم مال خرچ کرو سو ماں باپ کے لیے، قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔''

یہ خرچ کرنا زکوٰۃ کے علاوہ ہے، اس لیے کہ اس میں والدین پر خرچ کرنے کا ذکر ہے اور والدین کو تو زکوٰۃ دی ہی نہیں جا سکتی۔ قرآن مجید میں یہ بھی ارشاد ہے: ﴿وَیَسْـَٔلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ط قُلِ الْعَفْوَ ط﴾ (البقرہ: ۲۱۹) ''آپؐ سے پوچھتے ہیں کیا خرچ کریں؟ کہہ دیجیے جو بھی زائد از ضرورت ہو۔'' اسی لیے ہر امیر غریب کو اپنی حیثیت کے مطابق صدقہ کرنا چاہیے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ''جب آدمی اپنے گھر والوں پر ثواب اور اجر کی امید رکھ کر خرچ کرتا ہے تو یہ اس کے لیے صدقہ شمار ہوتا ہے۔'' (متفق علیہ)

صدقہ کی ترغیب دیتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ((أَنْفِقْ یَا ابْنَ آدَمَ أُنْفِقْ عَلَیْکَ)) (صحیح البخاری: ۵۳۵۲) ''اے آدمؑ کے فرزند! تُو (میرے ضرورت مند بندوں پر اپنی کمائی میں سے) خرچ کر، مَیں (اپنے خزانہ غیب سے) تجھ کو دیتا رہوں گا۔

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا:

''تم اللہ کے بھروسے پر اُس کی راہ میں کشادہ دستی سے خرچ کرتی رہو اور کنومت۔ اگر تم اُس کی راہ میں اس طرح حساب کر کے دو گی تو وہ بھی تمہیں حساب ہی سے دے گا۔ اور دولت جوڑ جوڑ کر اور بند کر کے نہ رکھو' ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تمہارے ساتھ یہی معاملہ کرے گا۔ لہٰذا تھوڑا بہت جو ہو سکے اور جس کی توفیق ملے' راہ خدا میں کشادہ دستی سے دیتی رہو۔'' (بخاری و مسلم)

انسان کے اندر لالچ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے' جس کی مذمت قرآن حکیم میں کئی مقامات پر مذکور ہے۔ انسان غفلت میں اس قدر آگے نکل جاتا ہے کہ اسے اپنی موت یاد نہیں رہتی جو ایک اٹل حقیقت ہے۔ وہ آخرت کی زندگی بھی بھول جاتا ہے' جس پر یقین تو مسلمان کا بنیادی عقیدہ ہے۔

﴿اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝١ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝٢ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝٣ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝٤ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝٥ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝٦ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۝٧ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۝٨﴾ (التکاثر)

''لوگو! تم کو مال کی بہت سی طلب نے غافل کر دیا' یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں۔ دیکھو عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ پھر دیکھو عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ دیکھو اگر تم جانتے یعنی علم الیقین رکھتے (تو غفلت نہ کرتے)۔ تم ضرور دوزخ دیکھو گے۔ پھر اس کو ایسا دیکھو گے کہ عین الیقین آ جائے گا۔ پھر اس روز تم سے (شکر) نعمت کے بارے میں پرسش ہو گی۔''

رضائے الٰہی کے لیے جو رقم خرچ کی جائے گی' اللہ تعالیٰ اسے اپنے ذمہ قرض شمار کرتا ہے۔ وہ اس کو بڑھا چڑھا کر واپس دے گا اور گناہوں کو بخش دے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝١٧﴾ (التغابن)

''اگر تم اللہ کو قرضِ حسنہ دو گے تو وہ اس کو دو چند کر دے گا اور تمہارے گناہ بھی معاف کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ قدر شناس اور بردبار ہے۔''

مال و دولت بچا بچا کے رکھنے کے نقصان کو واضح کر دیا گیا اور فی سبیل اللہ خرچ کرنے کا نفع بھی بتا دیا گیا۔ یہ فائدہ اس وقت ملے گا جب نیکیاں کمانے کا موقع ختم ہو چکا ہو گا اور انسان انتہائی بے بس ہو گا۔ اسی لیے یہ ہدایت دی گئی ہے کہ ہر شخص فکرمند رہے۔ دنیاوی زندگی کے

جائز فوائد حاصل کرنے کی اجازت ہے مگر اس میں خدا فراموشی کی حد تک مشغول ہو جانا برے انجام تک پہنچا دیتا ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۸﴾ (الحشر)

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص دیکھے کہ اس نے کل (یعنی قیامت) کے لیے کیا سامان آگے بھیجا ہے! (ہم پھر کہتے ہیں کہ) اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے۔''

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہوا:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۶۱﴾

''مثال اُن کی جو اپنے مال اللہ کی راہ میں (اللہ کے دین کے لیے) خرچ کرتے ہیں ایسے ہے جیسے ایک دانہ کہ اُس سے سات بالیاں (خوشے) پیدا ہوں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اللہ جس کو چاہتا ہے افزونی عطا فرماتا ہے۔ اور اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔''

جو شخص پُرخلوص ہو کر اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے اس کی معمولی سی رقم کو کئی گنا شمار کیا جائے گا۔ ریاکاری کسی بڑی سے بڑی نیکی کو بھی ضائع کر دیتی ہے۔ اسی طرح اگر فی سبیل اللہ خرچ کرتے وقت دکھاوا پیش نظر ہو یا شہرت مطلوب ہو تو ایسا صدقہ نامقبول ہے۔ ایسے لوگوں کو کہا جائے گا کہ تم نے جن کو خوش کرنے کے لیے خرچ کیا تھا اب انہی سے اجر طلب کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ تو صرف اسی صدقہ یا خیرات کو قبول کرتا ہے جس کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہو۔

﴿وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۠ فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ جَزَاۗءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ۝۳۷﴾ (سبا)

''اور (دیکھو!) تمہارے اموال اور تمہاری اولاد ایسی چیزیں نہیں کہ وہ تمہیں مرتبے میں

ہمارا مقرّب بنا دیں سوائے اُس شخص کے جو ایمان لایا اور اُس نے نیک اعمال کیے۔ تو ایسے لوگوں کے لیے ان کے اعمال کا دوگنا اجر ہے اور وہ بالاخانوں میں امن سے رہیں گے۔‘‘

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے متعدد مواقع ہیں۔ انہی میں سے ایک یہ ہے کہ اسلام کی سربلندی کے لیے خرچ کیا جائے تاکہ دُنیا میں عدل کا نظام قائم ہو۔ باطل نظام میں سودی معاملات کا دور دورہ ہوتا ہے اور ناداروں کی مدد کا کوئی قانون نہیں۔ یہ فکر عام ہوتی ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو وہ خود غریبوں کی مدد کرتا۔ اس کے برعکس‘ عدل کا نظام دنیا میں صحت مند معاشرہ قائم کرتا ہے۔ اسلام سلامتی کا دین ہے۔ جب اسلام کے احیاء کی کوشش کی جائے گی تو امن قائم ہوگا اور مخلوقِ خدا کو آسودگی حاصل ہوگی۔ یہ ایک طرح سے جہاد ہے‘ جسے اختیار کرنا بھی فضیلت کا باعث ہے۔ مالی جہاد کا موقع ہر وقت موجود ہوتا ہے اور یہ مال خرچ کرنے کی بہترین صورت بھی ہے۔

دُنیا کے مال کی محبت خسارے کا سودا ہے جبکہ انفاق فی سبیل اللہ میں حقیقی کامیابی ہے۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ وہ اللہ کی راہ میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرے۔ سود سے بظاہر تو مال میں اضافہ ہوتا ہے لیکن آخر کار یہ معاشی نظام کو برباد کر دیتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۷۶)

’’اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔‘‘

تاریخ کے صفحات اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ کوئی سخی جب انفاق کرتا ہے تو وہ کبھی نادار نہیں ہوتا۔ اگر اس بات پر پختہ یقین ہو کہ روزی اللہ ہی دیتا ہے تو اُسی کے دیے ہوئے مال میں سے فی سبیل اللہ خرچ کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

❁❁❁

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت‘ اہمیت ولزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

چند مہلک منکرات

حافظ محمد اسد ☆

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر اس دنیا میں بطور آزمائش بھیجا ہے۔ قدم قدم پر انسان کی جانچ ہوتی ہے کہ یہ اس میں پورا اترتا ہے یا نہیں۔ کبھی انسان کو بہت کچھ دیا جاتا ہے جبکہ کبھی سب کچھ لے کر آزمایا جاتا ہے۔ ہر انسان کو درپیش مسائل مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں اور وہ اپنے اعمال کا حساب بھی اپنے شاکلہ (مزاج وطبیعت) کے لحاظ ہی سے دے گا۔ موجودہ دور کا انسان احکاماتِ الٰہی کو جس طرح پسِ پشت ڈال رہا ہے اس کی مثال ملنا بہت مشکل ہے۔ ستم یہ کہ اسے یہ شعور وادراک بھی نہیں کہ مجھ سے کتنے سنگین گناہ سرزد ہو رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ توبہ واستغفار کرنا بھی اب رسماً ہی باقی رہ گیا ہے' جو خاص مواقع پر ہی کیا جاتا ہے۔ اس دور کے حوالے سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((بَادِرُوا بِالْأَعْمَالِ فِتَنًا كَقِطَعِ اللَّيْلِ الْمُظْلِمِ، يُصْبِحُ الرَّجُلُ مُؤْمِنًا وَيُمْسِي كَافِرًا، أَوْ يُمْسِي مُؤْمِنًا وَيُصْبِحُ كَافِرًا، يَبِيعُ دِينَهُ بِعَرَضٍ مِنَ الدُّنْيَا)) (صحیح مسلم :۳۱۳)

''ان فتنوں سے پہلے پہلے جو تاریک رات کے حصوں کی طرح (چھا جانے والے) ہوں گے' (نیک) اعمال کرنے میں جلدی کرو۔ (ان فتنوں میں) صبح کو آدمی مومن ہوگا اور شام کو کافر' یا شام کو مومن ہوگا تو صبح کو کافر۔ اپنا دین (ایمان) دنیوی سامان کے عوض بیچتا ہوگا۔''

شیخ محمد بن صالح عثیمینؒ (متوفی: جنوری ۲۰۰۱ء) اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

''اہم بات یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اندھیری رات کے فتنوں سے خبردار فرمایا' جس میں انسان صبح مومن ہوگا تو شام کو کافر ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنی حفاظت

☆ استاذ قرآن اکیڈمی یٰسین آباد' کراچی

میں رکھے۔ ایک دن میں ہی انسان اسلام سے پھر جائے گا' دائرہ اسلام سے خارج ہوجائے گا۔ اس کی وجہ کیا ہوگی؟ دنیا کے بدلے میں اپنے دین کا سودا کرلے گا۔ یہ مت سمجھیں کہ دنیا سے مراد صرف مال ہے بلکہ اس میں دنیا کی ہر چیز شامل ہے' چاہے وہ مال کی صورت میں ہو یا عزت و جاہ کی شکل میں' یا دنیاوی منصب یا عورت سمیت کسی بھی صورت میں ہو۔ دنیا کی ہر چیز دنیاوی متاع میں داخل ہوگی اور اسی کو اللہ تعالیٰ نے ساز و سامان سے تعبیر کیا ہے۔'' [شرح ریاض الصالحین]

اس روایت میں آنے والے دو رِفتن سے خبردار کیا گیا ہے۔ چنانچہ اعمالِ صالحہ میں جلدی کرنی چاہیے' کیونکہ یہی نجات کی وہ کنجی ہے جس کے سائے میں انسان اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔ دُنیاوی زندگی کی چمک دمک اور دولت کی ہوس انسان کو اپنے ایمان کا سودا کرنے پر آمادہ کر دیتی ہے اور وہ اپنے ضمیر کا سودا کر بیٹھتا ہے۔ ایسے میں ضروری ہے کہ نیکوکار لوگوں کی صحبت اختیار کی جائے اور اُن گناہوں سے بچا جائے جو جہنم میں لے جانے والے ہوں۔ جب اُمّت کا کثیر طبقہ اِن مہلک منکرات سے ناواقف ہو اور گناہ کو گناہ ہی نہ سمجھا جائے تو اصلاح ناممکن ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ ایسے منکرات کا صحیح فہم حاصل کیا جائے اور اُن سے بچنے کی حتی المقدور کوشش کی جائے۔

مرد وزن کا اختلاط

سب سے زیادہ عام اور مہلک گناہ جو معاشرے میں پھیل چکا ہے بلکہ اُسے گناہوں کی فہرست ہی سے نکال دیا گیا ہے وہ بدنظری' بدنگاہی ہے۔ اس کی اصل وجہ معاشرے میں پھیلا ہوا بے پردگی کا ماحول ہے جس کے باعث شرم وحیا اُٹھ چکی ہے۔ جس قوم سے شرم وحیا رخصت ہوجائے وہ اللہ کے عذاب کی مستحق ہوجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم مختلف قسم کے عذابوں میں گھرے ہوئے ہیں۔

مرد وزن کا اختلاط ایک زہریلا نشہ ہے جو اب ہمارے کلچر کا حصّہ بن چکا ہے' جبکہ اسلام نے اس پر سختی کے ساتھ پابندی عائد کی ہے۔ اس کی وجہ سے معاشرے پر بہت برے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور انسان آہستہ آہستہ شرم وحیا کا دامن چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ نتیجتاً وہ وقت آجاتا ہے کہ جب برائی بری نہیں لگتی بلکہ اسے قبول کرلیا جاتا ہے۔ پھر جو اصلاح کی کوشش

کر رہے ہوتے ہیں اُن کو دقیانوس اور تنگ نظر کہہ کر اپنے غبار آلود نظریات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ماہرینِ نفسیات اس کی وجہ ہمارے معاشرے میں رائج مخلوط تعلیمی نظام کو قرار دیتے ہیں۔ بقول اکبرالٰہ آبادی :

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی!

اس تعلیمی نظام کے تحت پنپنے والے ہمارے معصوم بچے مادر پدر آزادی کے خواہاں ہوتے جاتے ہیں۔ پرنٹ میڈیا' الیکٹرانک میڈیا' سوشل میڈیا نے تو گویا اُن کی غیرت کا جنازہ نکال دیا ہے۔ ڈراموں میں عشق کی کہانیاں دکھائی جا رہی ہیں اور رحمی رشتوں کو پیروں تلے روندا جا رہا ہے۔ اِن نحوستوں نے بے حیائی کا وہ طوفان برپا کیا ہے کہ مرد تو کیا عورتوں کی نگاہوں میں بھی وہ شرم وحیا خام ہی نظر آتی ہے جو کبھی مشرقی عورت کے مزاج کا خاصہ ہوا کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کے زنا اور ہم جنس پرستی جیسے سنگین جرائم کا ارتکاب ہو رہا ہے۔ پھر اس دور میں جبکہ غیر شرعی رسموں کی وجہ سے نکاح اور شادی کرنا مشکل بن گیا ہے' زنا عام ہو رہا ہے۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں مادر پدر آزادی کے قائل ہوتے نظر آ رہے ہیں۔ اس سیلاب بلا خیز اور بے راہ روی کے نتیجے میں اب صورت اس حد تک بگڑ چکی ہے کہ اچھے اچھے خاندانوں میں بھی کوئی شرم وحیا باقی نہیں رہی۔ اس کا اندازہ اُن کی بچیوں کے لباس کو دیکھ کر بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ نیم عریاں لباس کو اب کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا۔

سوال یہ ہے کہ آخر ہم اپنے بچوں کو کیا بنانا چاہتے ہیں جو ان پر کوئی روک ٹوک نہیں کرتے؟ اس تعلیمی نظام نے ماں باپ کا تقدّس پامال کر دیا ہے۔ بچے تو جب سدھرتے جب بڑوں کو کچھ احساس ہوتا' مگر افسوس کہ بڑوں نے بھی ان کے آزادی کے سفر میں ان کا ساتھ دینا شروع کر دیا ہے۔ دُنیا کی چند روزہ زندگی کے مزے کی خاطر اپنے بچوں کو دین سے دور رکھا۔ جب دنیاوی عیش وعشرت ہی مطمحِ نظر بن گیا تو آخرت کا تذکرہ کہیں بھول بھلیوں میں کھو کر رہ گیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں:

((مَا ظَهَرَ فِيْ قَوْمٍ الزِّنَا وَالرِّبَا اِلَّا أَحَلُّوا بِأَنْفُسِهِمْ عَذَابَ اللّٰهِ))

(مسند احمد:۳۸۰۹)

''جس قوم میں زنا اور سود پھیل گیا انھوں نے یقیناً اللہ کا عذاب اپنے اوپر اتار لیا۔''

سودی نظامِ معیشت

نہ صرف ہمارے بینک اکاؤنٹس سیونگ ہیں بلکہ کاروبار کے لیے قرضے اور گاڑی اور مکان کے لیے بینک سے بڑے بڑے ادھار پر سودی لین دین ہم بڑے ذوق شوق سے کرتے ہیں۔ ہمیں ذرّہ برابر بھی کوئی خوف نہیں کہ یہ معاملہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے اعلانِ جنگ ہے۔ قرآن کریم میں اس کی شدید مذمت کی گئی ہے' اور کثیر تعداد میں احادیث مبارکہ اس عمل کے قبیح تر ہونے پر شاہد ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے سود کھانے والے' کھلانے والے' اس کی گواہی دینے والے اور اس کا معاملہ لکھنے والے سب پر لعنت فرمائی۔ (ابن ماجہ: ۲۲۷۷)

افسوس کہ آج اس حوالے سے کوئی جانتا ہی نہیں۔ اس سودی نظام کے اندر ہم بری طرح جکڑے جا چکے ہیں۔ یہ وہی زمانہ ہے جس کی خبر جناب رسول کریم ﷺ نے بایں الفاظ دی ہے:

((لَيَأْتِيَنَّ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يبقى مِنْهُمْ أَحَدٌ اِلَّا آكِلُ الرِّبَا، فَمَنْ لَمْ يَأْكُلْ أَصَابَهُ مِنْ غُبَارِهِ)) (ابن ماجه:۲۲۷۸)

''ایک زمانہ ضرور ایسا آئے گا کہ کوئی بھی سود سے نہ بچ سکے گا اور کوئی شخص سود خوری سے بچ بھی گیا تو بھی سود کے دھویں اور غبار سے نہیں بچ سکے گا۔''

بچنا تو درکنار ہمارا المیہ تو یہ ہے کہ جو دینی جماعتیں سود کے خاتمے کے لیے آواز بلند کرتی ہیں ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ مادہ پرست ذہنیت کے افراد کا کہنا ہے کہ اب سود کے بغیر کام نہیں چلتا۔ گویا ہم اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے خلاف اعلانِ جنگ جاری رکھیں گے۔ جب تک یہ سودی معاملات چلتے رہیں گے' معیشت مستحکم نہیں ہو سکے گی۔ غریب آدمی دن بدن بدترین صورت حال سے دوچار ہوتا رہے گا۔ مہنگائی اور بے روزگاری بڑھتی چلی جائے گی۔ خودکشی اور اپنے بچوں کو ہلاک کر دینے جیسے دل سوز واقعات میں اضافہ ہوگا۔ اربابِ اختیار کو چاہیے کہ ہوش کے ناخن لیں اور وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے پر دیانت داری سے عمل کر کے اس سودی نظام کو ختم کرنے کا عزم کریں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو طرح طرح کے عذابات ہم پر مسلّط ہوتے چلے جائیں گے۔

غیبت سننا اور کرنا

یہ مہلک مرض آج تقریباً ہر خاص و عام کی مجلس کا حصّہ بن چکا ہے۔ یہ برائی ہمارے معاشرے میں اس طرح رائج ہو چکی ہے کہ جہاں دو افراد جمع ہوئے' تیسرے فرد کا ذکر لازمی طور پر کریں گے۔ ہم یہ کام بطور مشغلہ کرتے ہیں جبکہ قرآن کریم میں جن معاشرتی برائیوں کا ذکر کیا گیا ہے اُن میں غیبت کے حوالے سے بڑے سخت الفاظ آئے ہیں:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۲﴾ (الحجرات)

''اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچو' بعض گمان گناہ ہوتے ہیں' اور کسی کی ٹوہ میں نہ لگو اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ اس سے تو خود تم نفرت کرتے ہو۔ اور اللہ سے ڈرو' بے شک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا' بہت مہربان ہے۔''

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب حفظہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں چند نکات تحریر کیے ہیں:

(۱) کسی کے خلاف تحقیق کے بغیر بدگمانی دل میں جما لینا گناہ ہے۔

(۲) کسی دوسرے کے عیب تلاش کرنے کے لیے اس کی ٹوہ اور جستجو میں لگنا بھی اس آیت کی رُو سے گناہ ہے۔ البتہ کوئی حاکم مجرموں کا پتہ لگانے کے لیے تفتیش کرے تو وہ اس میں داخل نہیں ہے۔

(۳) غیبت کی تعریف ایک حدیث میں خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمائی ہے کہ: تم اپنے بھائی کا تذکرہ اس طرح کرو جو اسے ناگوار ہو۔ ایک صحابی نے پوچھا: اگر اس میں واقعی وہ عیب ہو تو (کیا اس کا بیان کرنا بھی غیبت ہے)؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر اس میں واقعی وہ عیب ہو تب تو وہ غیبت ہے اور اگر نہ ہو تو بہتان ہے' یعنی وہ دوہرا گناہ ہے۔

اس تناظر میں ہم اپنا جائزہ لیں کہ کیا ہماری مجالس غیبت اور بدگمانیوں سے خالی ہوتی ہیں۔ ایک صاحبِ علم نے کہا کہ آج اگر ہم اپنی مجالس سے بدگمانی اور غیبت کو نکال دیں تو بخدا خاموش ہی رہا کریں گے۔

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت مبارکہ کے ذیل میں فرماتے ہیں:

''گمان کرنے سے بچنے کا حکم دیا گیا (کیونکہ گمان ایک دوسرے کو عیب لگانے کا سبب ہے)' اس پر قبیح افعال صادر ہونے کا مدار ہے اور اسی سے خفیہ دشمن ظاہر ہوتا ہے۔ کہنے والا جب ان اُمور سے یقینی طور پر واقف ہوگا تو وہ اس بات پر بہت کم یقین کرے گا کہ کسی میں عیب ہے تاکہ اسے عیب لگائے' کیونکہ کبھی فعل بظاہر قبیح ہوتا ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا' اس لیے کہ ممکن ہے کرنے والا اسے بھول کر کر رہا ہو یا دیکھنے والا غلطی پر ہو۔'' (تفسیر کبیر' الحجرات: ۱۲)

مذکورہ بالا مہلک منکرات سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم گناہ کو گناہ سمجھیں اور اپنے موجودہ معاشی اور تعلیمی نظام کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ یہ کام اگرچہ اہلِ اقتدار یا حکام کا ہے لیکن ہم بھی بری الذمہ نہیں ہیں۔ ہمیں اپنے حصّے کا کام کرنا ہے۔ اپنے دائرہ میں رہتے ہوئے ان منکرات سے خود بھی بچنا ہے اور اپنے اہل وعیال کو بھی بچانا ہے۔ زنا اور عریانیت میں مبتلا سماج پر احادیث کے مطابق عذابِ الٰہی اور امراض وآفات کا نزول ہوکر رہتا ہے۔ ان سے حفاظت کی تدبیر صرف یہ ہے کہ ملت کا ہر فرد پہلے خود عفت مآب بنے اور پھر اپنے گھر' خاندان اور سماج کو بے حیائی اور بے حجابی کی لعنت سے پاک کرنے کی مہم میں لگ جائے۔ اگر ہم صدق دل سے تائب ہوکر اس کے خاتمے کی جِدّوجُہد میں لگ جائیں گے تو بروز قیامت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سامنے عرض کرسکیں گے: ''اے اللہ! ہم نے تو کوشش کی جو ہمارے اختیار میں تھی' معاشرے کو مکمل طور پر بدلنا ہمارے اختیار میں نہیں تھا''۔ دنیاوی زندگی چندروزہ ہے' جس کے بعد اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سامنے حاضری لازمی ہے۔ ہماری عملی جِدّوجُہد اگر خلوص پر مبنی ہوگی تب ہی اُخروی نجات ملے گی۔ ربّ العزت سے دعا ہے کہ ان منکرات سے مجھے اور آپ کو بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یاربّ العالمین!

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

مسئلہ فلسطین: ایک طائرانہ نظر

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان

تاریخی پس منظر

فلسطین مغرب میں صحرائے سینا و بحیرۂ روم اور مشرق میں نہر اردن کے درمیان میں ایک چھوٹا سا خطہ ہے جہاں قدیم ترین زمانے سے کنعانی یا اموری قوم رہتی آئی ہے۔ یہ تاجر اور کسان لوگ تھے۔ مصر سے آنے والے یہودیوں کی انہی سے لڑائی ہوئی تھی۔ یہودیوں نے ان کو ''فلستینی'' کہا اور اس کے معنی ''شرابی، کبابی'' کے رکھ دیے۔ اس علاقے کے قدیم باشندوں کی غلطی یہودیوں کے نزدیک صرف یہ تھی کہ انہوں نے یہودیوں کے مصر سے نکلنے کے بعد ان کا استقبال ''پانی اور روٹی سے نہیں کیا'' (تورات، تثنیہ ۲۳)۔ اس لیے وہ گردن زدنی کے مستحق ہوئے۔

یہودی تقریباً ۱۲۲۰ ق م میں حضرت یوشع (Jushua) کی قیادت میں صحرائے سینا سے نکلنے کے بعد فلسطین میں داخل ہوئے۔ تورات (سفر یشوع) کے مطابق انہوں نے انتہائی وحشت کے ساتھ فلسطینیوں کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

کنعانی یبوسی قبیلہ Jebusites بیت المقدس کے اردگرد رہتا تھا۔ یہ لوگ ۱۴۰ سال تک یہودیوں کا مقابلہ کرتے رہے اور ۱۰۴۹ ق م میں صرف حضرت داؤد علیہ السلام اس علاقے پر قبضہ کر پائے۔ شاؤل ۱۰۲۰ ق م میں پہلا حاکم ہوا جس نے سب یہودیوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کیا۔ اس کے بعد حضرت داؤدؑ آئے جن کا زمانہ ۱۰۰۰ سے ۹۶۱ ق م تک کا ہے۔ انہوں نے ۹۹۰ ق م میں فلسطینی قبائل پر قابو پایا اور دمشق کو خراج دینے پر مجبور کیا۔ صرف حضرت داؤد اور حضرت سلیمان (علیہما السلام) کے زمانے میں یہودیوں نے فلسطین کے ایک بڑے خطے پر حکومت کی۔

حضرت داؤدؑ کے بعد حضرت سلیمانؑ آئے جن کا زمانہ ۹۶۱ تا ۹۲۲ ق م کا ہے۔ انہوں نے بیت المقدس میں ایک یہودی معبد بنایا جو ''ہیکل'' (Temple) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ اس کی ایک دیوار آج بھی موجود ہے۔ مسلمان اسے مسجد اقصیٰ کی ''مغربی دیوار''

(الحائط الغربی) کہتے ہیں جبکہ یہودی اس کو ''دیوارِ گریہ'' (Wailing Wall) کا نام دیتے ہیں۔ اس سلطنت کے تعلقات یمن تک سے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے ۹۲۲ ق م میں وفات پاتے ہی ان کی سلطنت دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئی۔ جنوب میں ''یہودا'' اور شمال میں ''اسرائیل'' نامی دو ملک وجود میں آئے جو آپس میں دو سو سال تک لڑتے رہے۔

حضرات داؤد اور سلیمان (علیہما السلام) نے تقریباً چالیس چالیس سال حکومت کی' اس کے بعد سب ختم ہوگیا۔ لڑائیوں وغیرہ کو چھوڑ دیا جائے تو فلسطین پر صرف ۷۰ سال پورے طور پر یہودی حکومت رہی۔ بہترین حالات میں بھی یہودیوں نے پورے فلسطین پر کبھی قبضہ نہیں کیا۔ مؤرخ بیلوک کے مطابق' ان کے دورِ عروج میں بھی اس مملکت کی لمبائی ۱۲۰ میل اور چوڑائی ۶۰ میل تھی (یعنی موجودہ غزہ سے ملتی جلتی)۔ انہوں نے زیادہ تر پہاڑی علاقوں پر قبضہ کیا جبکہ وادی کے علاقے فلسطینیوں کے پاس رہے۔

آشوریوں نے ۷۲۱ ق م میں پہلی بار ''اسرائیل'' کو ختم کر کے یہودیوں کو مشرق کی طرف دھکیل دیا اور دوسرے لوگ ان کی آبادیوں میں بسا دیے۔ یوں ان کا تاریخ سے نام و نشان مٹ گیا۔ البتہ دوسری یہودی حکومت ''یہودا'' بچ گئی تھی' جس کا صدر مقام اور شلیم تھا۔ ۵۹۷ ق م میں بخت نصر (Nebuchadnezzar) نے اس حکومت کا بھی خاتمہ کر دیا اور اس کے بادشاہ یواقیم (Joacqim) سمیت دس ہزار یہودیوں کو یرغمال بنا کر بابل لے گیا۔ ان میں نبی حضرت حزقیال بھی شامل تھے۔ جلد ہی باقی ماندہ یہودیوں نے بغاوت کی' جس کی وجہ سے بخت نصر ۵۸۷ ق م میں دوبارہ فلسطین آیا' اور شلیم کی اینٹ سے اینٹ بجادی' مزید بہت سے یہودیوں کو غلام بنا کر بابل لے گیا اور باقی ماندہ یہودیوں کو اس علاقے سے نکال دیا۔ یوں سلطنت ''اسرائیل'' کے ختم ہونے کے ۱۳۰ سال بعد سلطنت ''یہودا'' کا بھی مکمل طور پر خاتمہ ہوگیا۔

۵۳۹ ق م میں یہودیوں کی بابل کی غلامی ختم ہونے پر واپسی ہوئی۔ ایران کے بادشاہ کورش دوم نے فلسطین کے علاقے پر قبضہ کرنے کے بعد یہودیوں کو فلسطین میں دوبارہ بسنے کی اجازت دی۔ یوں ۵۱۵ ق م میں ہیکل سلیمانی (Second Temple) دوبارہ بنا۔

۶۳ ق م سے ۷۰ء تک فلسطین پر رومن قبضہ رہا۔ یہودیوں کی بغاوت کی وجہ سے ۷۰ء میں رومن جنرل ٹائٹس (Titus) فلسطین آیا اور پوری طرح اور شلیم اور ہیکل کو تباہ کر کے اس کی

جگہ ایک رومن شہر بنام ''ایلیا کاپیتولینا'' بنا کر واپس گیا۔ یہودیوں کو وہاں سے پوری طرح سے جلاوطن کر دیا گیا۔

۲۷۳ء میں انباط (عربوں) نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا۔

۶۳۹ء (۱۵ھ) میں بیت المقدس حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں فتح ہوا جب کہ وہاں عیسائیوں کی حکومت تھی۔ مسجد اقصیٰ کی جگہ اُس وقت کوڑا پڑا ہوا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس جگہ کو اپنے ساتھیوں کی مدد سے صاف کیا اور وہاں نماز پڑھی۔ بعد میں اس جگہ پر ایک مسجد بنی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں ''العہد العمری'' نامی وثیقہ لکھا گیا جس میں یہودیوں کا بیت المقدس میں داخل ہونا منع کیا گیا' اور یہ وہاں کے عیسائیوں کی درخواست پر ہوا۔

۱۰۹۹ء سے ۱۳۶۹ء تک صلیبی جنگیں جاری رہیں جو فلسطین پر یورپی عیسائی قوموں کے قبضے کی کوشش تھی' کیونکہ ان کے خیال میں حضرت مسیح علیہ السلام کی جائے پیدائش کو غیر عیسائیوں کے قبضے میں نہیں رہنا چاہیے۔ کل ۹ صلیبی جنگیں ہوئیں۔ بالآخر اکتوبر ۱۱۸۷ء میں صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس کو صلیبیوں کے ۹۹ سالہ قبضے کے بعد واپس لیا اور یہودیوں کو دوبارہ بیت المقدس آنے کی اجازت دی۔ انہوں نے بیت المقدس کی حفاظت کے لیے مراکش سے جفاکش مسلمانوں کو بلا کر مسجد اقصیٰ کے پاس بسایا۔ ان کا محلہ ''حیّ المغاربة'' ۱۹۶۷ء تک باقی تھا۔ جون ۱۹۶۷ء میں اسرائیل نے بیت المقدس پر قبضے کے بعد چھ گھنٹے کے نوٹس پر ان کو باہر کر دیا اور ان کے گھر مسمار کر کے ''دیوارِ گریہ'' کے سامنے ایک بڑا میدان بنا دیا جہاں یہودی اب عبادت کرتے ہیں۔

یورپ میں مستقل برے سلوک اور ابھرتی ہوئی نئی قومیتوں کی وجہ سے وہاں کے یہودیوں میں ''یہودی وطن'' کی بات شروع ہوئی' حالانکہ نہ ان کا اپنا کوئی ملک تھا اور نہ ہی کسی علاقے میں ان کی اکثریت تھی۔ آسٹرین صحافی ہرتزل (Herzl) نے صہیونی تحریک شروع کی۔ ۱۸۶۰ء میں یہودیوں نے فلسطین میں دوبارہ بسنا شروع کیا۔ اُس وقت فلسطین میں یہودیوں کی کل آبادی پانچ ہزار تھی۔ فرانس کے بارون ہرش (Baron Hirsh) نے اس کام کے لیے پیسے دیے۔ بعد میں برطانیہ کے لارڈ روتھ چائلڈ (Lord Rothchild) نے بھی اس مقصد کے لیے کافی پیسے دیے تاکہ یہودی فلسطین میں زمینیں خرید کر وہاں بسنا شروع کریں۔

اعلانِ بالفور

پہلی جنگ عظیم کے دوران برطانیہ نے ''اعلانِ بالفور'' جاری کر کے فلسطین میں ''یہودی وطن'' بنانے کا وعدہ کیا' جبکہ اسی وقت سائکس پیکو (Sykes Picot) معاہدے کے ذریعے فرانس کے ساتھ اس علاقے کو آپس میں بانٹنے اور شریف مکہ سے معاہدہ کر کے اس پورے علاقے میں ''عرب حکومت'' قائم کرنے کا جھوٹا وعدہ کیا۔ جس وقت یہ وعدے کیے گئے' برطانیہ یا فرانس کا اس پورے علاقے کے کسی حصے پر قبضہ نہیں تھا۔

اکتوبر ۱۹۱۸ء میں فلسطین پر برطانوی قبضہ ہو گیا جس کے بعد اعلانِ بالفور پر عمل کرتے ہوئے فلسطین کو یہودی ہجرت کے لیے کھول دیا گیا۔ ساٹھ سال سے مسلسل ہجرت کے باوجود اُس وقت تک فلسطین میں یہودیوں کی تعداد صرف ۵۶۰۰۰ تھی۔

برطانیہ نے فلسطین میں یہودیوں کو ہر سہولت کے ساتھ نیم فوجی دہشت گرد مسلّح تنظیم ہاگانا (Haganah) بنانے کی اجازت دی۔ اس کی وجہ سے عملاً فلسطین میں ایک مسلّح یہودی فوج تیار ہوئی' جبکہ عربوں کے اسلحے چھینے گئے اور یہودیوں کے برعکس عربوں کے اسلحہ رکھنے پر جیل اور جلاوطنی کی سزا مقرر ہوئی۔ اس کے علاوہ متعدد یہودی دہشت گرد تنظیموں کا قیام عمل میں آیا' مثلاً ارگون' شترن' لیہی اور اتزیل جنھوں نے ۱۹۴۸ء میں عربوں کو اپنے وطن سے بندوق کے ذریعے کھدیڑنے کا کام کیا۔ ان تنظیموں کو بعد میں اسرائیلی فوج میں ضم کر دیا گیا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اسے فلسطین سے بھاگنے پر مجبور کرنے کے لیے اب یہودی دہشت گردوں نے انگریز فوج اور انتظامیہ پر حملہ کرنا شروع کر دیا۔ فلسطین میں یہودی دہشت گردی کا سامنا کرنا کمزور برطانیہ کے بس میں نہیں تھا' اس لیے اس نے فلسطین کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے اقوام متحدہ کے سامنے پیش کر دیا۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۲۹ رنومبر ۱۹۴۷ء کو فلسطین کو یہودی اور عرب ریاستوں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا۔ عرب اکثریت کو ۴۴ فیصد اور یہودی اقلیت کو ۵۶ فیصد دیا گیا۔ عربوں نے اس ظالمانہ فیصلے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ یہودیوں نے مارچ ۱۹۴۸ء سے ''آپریشن دالیت'' کے تحت فلسطین میں اسرائیل بنانے کے لیے عربوں پر حملے اور قتل عام شروع کر دیے تاکہ وہ یہودی سلطنت سے بھاگ جائیں۔ اس کے ردِّ عمل کے طور پر عرب ممالک (مصر' اردن اور عراق

وغیرہ) نے فلسطین میں اپنی فوجیں بھیجیں جن کو واضح حکم تھا کہ تقسیم پلان کے تحت یہودیوں کو دیے گئے حصے پر قبضہ نہ کریں۔ یوں عرب فوجیں آگے نہیں بڑھیں' جبکہ یہودی دہشت گرد تنظیمیں حملے کر کے عربوں کو قتل اور مختلف علاقوں سے نکالتی رہیں۔ فلسطین کے ۷۰ فیصد عرب اپنے علاقوں سے بھاگ کر قریبی علاقوں اور ملکوں میں پناہ گزیں ہو گئے' اور پھر اقوام متحدہ کی بیسیوں قراردادوں کے باوجود آج تک اپنے گھروں کو واپس نہ جا سکے۔

اسرائیل کا قیام

۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو یہودیوں نے اسرائیل کے قیام کا اعلان کر دیا اور فلسطین میں خانہ جنگی چھڑ گئی۔ امریکا اور روس نے چند گھنٹوں کے اندر اسرائیل کو تسلیم کر لیا۔ ۱۹۴۹ء میں جنگ بندی تک فلسطین میں ۷۸ فیصد زمینوں پر یہودی قابض ہو گئے' یعنی فلسطینی عربوں کے لیے ان کے ملک کا صرف ۲۲ فیصد حصّہ بچا۔ اس باقی ماندہ فلسطین کے ایک حصے (مغربی کنارہ بشمول بیت المقدس) پر اُردن نے اور دوسرے حصے (غزہ) پر مصر نے قبضہ کر لیا۔

۵ جون ۱۹۶۷ء کو اسرائیل نے حملہ کر کے باقی ماندہ ۲۲ فیصد فلسطین کے ساتھ مصر کے صحرائے سینا اور شام کی جولان پہاڑیوں (Golan Heights) پر بھی قبضہ کر لیا۔

''کیمپ ڈیوڈ'' اور ''اوسلو'' معاہدے

اکتوبر ۱۹۷۳ء میں مصر اور شام نے اپنے علاقے آزاد کرانے کے لیے جنگ کی۔ مصر نے صحرائے سینا کا ایک تہائی علاقہ واپس لے لیا جبکہ شام ناکام رہا۔ اس کے بعد ۱۹۷۹ء میں مصری صدر سادات نے اسرائیل کے ساتھ ''کیمپ ڈیوڈ معاہدہ'' کر کے صلح کر لی' جس کی وجہ سے اسرائیل پر دباؤ بہت کم ہو گیا اور دوسرے عرب وغیر عرب ممالک نے اسرائیل کے ساتھ تعلقات قائم کرنے شروع کر دیے۔ اس سے پہلے دنیا کے اکثر ممالک (بشمول بھارت) اسرائیل کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔

باقی ماندہ فلسطین پر مسلسل اسرائیلی قبضے کے خلاف فلسطینیوں کا پہلا انتفاضہ دسمبر ۱۹۸۷ء سے ۱۹۹۱ء کی میڈرڈ کانفرنس تک چلا۔ تھک ہار کر بالآخر فلسطینی قیادت نے ۱۹۹۲ء میں اسرائیل کے ساتھ ''اوسلو معاہدہ'' کیا جس کی رو سے پانچ سال میں خودمختار فلسطینی ریاست قائم ہونا قرار پایا' جبکہ فلسطین کے بنیادی مسائل (بیت المقدس/ پناہ گزین/ سرحد/ داخلی وسائل) کو بعد کے

لیے چھوڑ دیا گیا۔ پانچ سال کے اندر فلسطینی ریاست وجود میں آنی تھی لیکن تیس سال کے بعد بھی آج تک وجود میں نہیں آئی ہے۔ فلسطینی اتھارٹی (فلسطینی مقتدرہ) کے نام پر جو علاقہ موجود ہے اس کی حیثیت صرف ایک میونسپلٹی کی ہے۔ وہ اسرائیل کے مخبر کے طور پر کام کرتی ہے' یعنی اس کے خلاف مزاحمت کرنے والے فلسطینیوں کے بارے میں اسرائیل کو باخبر کرتی ہے اور اسی وجہ سے وہ فلسطینی عوام میں مقبول نہیں ہے۔

اوسلو معاہدہ کرنے والے اسرائیلی وزیراعظم اسحاق رابین کو یہودی شدّت پسندوں نے ۴ر نومبر ۱۹۹۵ء کو قتل کر دیا۔ اسرائیل میں فلسطینیوں سے کسی بھی سمجھوتے کی مخالف لیکوڈ پارٹی نے امریکی نیوکون کی مدد سے کلین بریک (Clean Break) نامی پلان بنوایا تاکہ اوسلو معاہدے کو عملاً کالعدم کیا جا سکے۔ ۱۹۹۷ء میں لیکوڈ کے برسرِاقتدار آتے ہی اس پلان پر عمل شروع ہو گیا اور دھیرے دھیرے فلسطینی مقتدرہ کو بے اختیار بنانے کے عمل کا آغاز ہو گیا' جبکہ فلسطینی حکومت کو دیے جانے والے علاقوں میں یہودی نوآباد بستیاں بنانے کا کام تیزی سے شروع ہو گیا۔ سارا الزام عربوں پر رکھا گیا جبکہ درحقیقت معاہدے کو ناکام اسرائیل نے بنایا۔ اس کے نتیجے میں ۲۰۰۰ء میں دوسرا انتفاضہ شروع ہوا جو پانچ سال چلا۔

مئی ۲۰۱۲ء میں یوسی بیلین (Yossi Beilin) نے' جو اسرائیل کی جانب سے اوسلو معاہدہ کا آرکٹیکٹ تھا' فلسطین اتھارٹی کو مشورہ دیا کہ اتھارٹی کو تحلیل کر دو تاکہ دنیا کے سامنے اسرائیل کا اصل چہرہ سامنے آجائے۔ یہودی نوآبادیاں فلسطینی عربوں کی ان زمینوں پر مستقل قائم ہو رہی ہیں جنہیں اسرائیل بھی مانتا ہے کہ انہیں فلسطینیوں کو واپس کرنا ہے۔

حماس کی مزاحمت

اگست۔ستمبر ۲۰۰۵ء میں حماس کی مزاحمت کی وجہ سے اسرائیل غزہ سے نکل گیا لیکن علاقے پر بری' بحری اور فضائی کنٹرول قائم رکھا۔ جنوری ۲۰۰۶ء میں حماس کی منتخب حکومت کو اسرائیل' امریکہ اور یورپ وغیرہ نے مل کر چند مہینوں کے اندر توڑ دیا اور ۲۰۰۷ء سے اسرائیل نے غزہ کا مکمل محاصرہ شروع کر دیا جو اب تک جاری ہے۔

غزہ پر اسرائیلی حملے ۲۰۰۶ء' ۲۰۰۸ء' ۲۰۰۹ء' ۲۰۱۰ء' ۲۰۱۱ء' ۲۰۱۲ء میں ہوئے۔ ۲۰۱۴ء میں رمضان المبارک کے دوران اسرائیل نے حملہ کر کے غزہ کو شدید نقصان پہنچایا لیکن

مزاحمت کو شکست نہ دے سکا۔ حماس نے اس جنگ کا ۵۱ دن تک مقابلہ کیا اور دنیا کی پانچویں طاقتور فوج کو جنگ بندی پر مجبور کر کے بڑی حد تک اپنے مطالبات منوا لیے۔ اسرائیل اپنے مطالبات (راکٹ حملے بند کرانا' غزہ کو اسلحے سے خالی کرانا اور سرنگوں کا خاتمہ) قبول کرانے میں ناکام رہا۔

۲۰۱۸ء میں غزہ کے لوگوں نے محاصرے کے خلاف سرحد پر احتجاج شروع کیا۔ اسرائیل نے فائرنگ کر کے سات فلسطینیوں کو قتل کر دیا۔

مارچ ۲۰۱۹ء میں اسرائیل نے غزہ پر پھر حملہ کیا۔ اس کے بعد مئی ۲۰۱۹ء' نومبر ۲۰۱۹ء' ۲۰۲۱ء' ۲۰۲۲ء اور مئی ۲۰۲۳ء میں بھی غزہ پر اسرائیلی حملے ہوئے۔ مئی ۲۰۲۱ء میں اسرائیلی حملہ پہلے کی طرح نہ صرف ناکام رہا بلکہ یہ بھی ثابت ہو گیا کہ حماس اور الجہاد الاسلامی اسرائیل کے ساتھ فوجی برابری (deterrence) کی حد تک پہنچ چکے ہیں۔ اس جنگ میں پہلی دفعہ اسرائیل کا بہت جانی و مالی نقصان ہوا۔ فلسطینیوں نے اسرائیل کے اندر انتقامی کارروائی کی اور اسے یک طرفہ جنگ بندی پر مجبور کر دیا۔ اس جنگ کے دوران ۲۴۲ فلسطینی شہید ہوئے' غزہ کے ۸۰,۰۰۰ لوگ بے گھر ہوئے اور ۱۷,۰۰۰ رہائشی اور تجارتی یونٹس تباہ ہوئے۔

غزہ کی حالیہ جنگ

۷ر اکتوبر ۲۰۲۳ء کو حماس نے اسرائیل پر اچانک بڑا حملہ کیا جو اس کے لیے بالکل غیر متوقع تھا۔ یہ حملہ ۱۹۶۷ء کے اسرائیلی قبضے اور ۲۰۰۶ء سے جاری اسرائیلی محاصرے کے خلاف تھا۔ یہ حملہ ہر طرح سے بین الاقوامی قانون کے تحت مقبوضہ علاقوں کے باشندوں کے حق مزاحمت کا استعمال تھا۔ اس کے جواب میں اسرائیل نے غزہ کو پوری طرح تباہ کرنا شروع کر دیا۔ جنگ اب اپنے دوسرے سال میں داخل ہو رہی ہے۔ انسانی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی کہ ایک مختصر اور نہتی آبادی دنیا کی پانچویں بڑی فوجی طاقت کے خلاف اتنے لمبے عرصے تک اتنی بہادری سے لڑتی رہے۔ اس سے پہلے عرب فوجوں کی اسرائیل سے لڑائی صرف چند دن چلتی تھی۔ اس جنگ میں اسرائیل نے بے دریغ بمباری کی ہے۔ غزہ کے تقریباً ۹۰ فیصد گھر اور بلڈنگیں اس اندھا دھند بمباری سے منہدم ہو چکے ہیں۔ پانی' بجلی' سیوریج لائن اور ٹیلیفون و انٹرنیٹ کی لائنیں پوری طرح تباہ ہو چکی ہیں۔ یہ بمباری دنیا بھر میں پچھلے ایک سو سال کے دوران کی گئی

شدید ترین بمباری ہے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں بھی کسی علاقے پر اتنی شدید بمباری نہیں ہوئی تھی۔

اسرائیل اور امریکہ کا پلان تھا کہ شدید بمباری اور کھانے پینے کی اشیاء کو بالکل روکنے سے غزہ کے لوگ مصر کے صحرائے سینا کی طرف بھاگ جائیں گے اور یوں غزہ کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل ہو جائے گا' لیکن غزہ کے لوگوں نے اس سازش کو ناکام بنا دیا۔

غزہ میں مکمل سرائیلی محاصرے کی وجہ سے کھانے پینے کی چیزوں اور دواؤں کی شدید قلت ہے جس کی وجہ سے وہاں سینکڑوں لوگ خاص طور سے بچے بھوک پیاس سے ہلاک ہو چکے ہیں۔ تمام اسپتال تقریباً تباہ ہو چکے ہیں۔ اسرائیل نے غزہ کے لوگوں کو اپنے اپنے علاقوں سے نکل کر صحرائے سینا سے ملے ہوئے غزہ کے جنوب مغربی شہر رفح میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا ہے لیکن وہ وہاں بھی اسرائیلی حملوں سے محفوظ نہیں ہیں۔ موجودہ جنگ سے پہلے غزہ میں روزانہ ۵۰۰ ٹرک کھانے اور ادویات وغیرہ کے داخل ہوتے تھے' اب وہاں صورت حال نہایت ابتر ہے۔ اسرائیلی حملوں میں سینکڑوں صحافی قتل ہو چکے ہیں جن میں زیادہ تر فلسطینی ہیں۔

عالمی ردِّعمل

جنوبی افریقہ نے ہیگ میں واقع بین الاقوامی عدالت میں اسرائیل کے خلاف مقدمہ دائر کیا کہ وہ غزہ میں نسل کشی کا ارتکاب کر رہا ہے۔ بین الاقوامی عدالت نے اسرائیل کی سرزنش کی اور اس کو نسل کشی روکنے کو کہا لیکن اس کا اسرائیل پر کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے' کیونکہ اس کو امریکہ اور مغربی ممالک خصوصاً جرمنی اور برطانیہ کی پوری پشت پناہی حاصل ہے۔ اسی جنگ کے دوران اسرائیل کو بچانے کے لیے امریکہ متعدد بار اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل میں جنگ بندی کی قرارداد کے خلاف ویٹو استعمال کر چکا ہے۔ نیز جنگ کے دوران اسرائیل کی بھرپور جنگی اور مالی مدد کر رہا ہے۔ جنگ کے شروع ہوتے ہی امریکہ نے اپنے دو بحری بیڑے علاقے میں بھیج دیے تاکہ کوئی ملک اسرائیل کے خلاف جنگ میں شامل نہ ہو سکے۔

نسل کشی کے مقدمے کے علاوہ' دنیا کے ۵۲ ممالک نے بین الاقوامی عدالت میں اسرائیل کے خلاف ایک اور مقدمہ دائر کیا کہ غزہ' مغربی پٹی اور بیت المقدس پر ۱۹۶۷ء سے جاری اسرائیلی قبضہ ہٹایا جائے۔ افسوس ہے کہ مقدمہ زیادہ تر غیر عرب اور غیر مسلم ملکوں نے دائر

کیا۔غزہ کی جارحیت کی وجہ سے متعدد غیر مسلم ملکوں نے اسرائیل سے سفارتی تعلقات توڑ لیے ہیں لیکن کسی عرب یا مسلم ملک کو یہ توفیق نہیں ہوئی' بلکہ کچھ تو در پردہ اسرائیل کی مدد کر رہے ہیں۔

اس جنگ کے دوران حزب اللہ اور لبنان کی الجماعۃ الاسلامیۃ نے شمالی اسرائیل پر حملے کیے ہیں۔عراق کی کچھ ملیشیا نے بھی اسرائیلی اور امریکی ٹھکانوں پر حملے کیے ہیں۔یمن کی انصار اللہ حکومت نے باب المندب اور بحر احمر سے اسرائیلی بحری جہازوں یا اسرائیل سامان لے جانے والے بحری جہازوں پر پابندی لگا دی ہے اور اس طرح کے کچھ بحری جہازوں پر حملہ بھی کیا ہے۔اسی وجہ سے یمن پر امریکہ اور برطانیہ مستقل حملے کر رہے ہیں۔

سارے نقصانات کے باوجود موجودہ جنگ نے اسرائیل کے خلاف پاسا الٹ دیا ہے۔ اسرائیل کے فوجی تفوق کا دعویٰ اور اس کی بنیاد پر عربوں کا بلیک میل اب قصّۂ پارینہ بن چکا ہے۔سفارتی طور پر اسرائیل کو ہر جگہ منہ کی کھانی پڑ رہی ہے۔عرب ممالک سے اسرائیل کے تعلقات کی گاڑی رک چکی ہے۔فلسطین کا مسئلہ اب دوبارہ عرب اور مشرق وسطیٰ کی سیاست کا اولین مسئلہ بن چکا ہے۔حماس اور فلسطینی مزاحمت کو اب کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا۔غزہ اور حماس نے اسلامی تاریخ میں ایک سنہری باب کا اضافہ کیا ہے' جو عین جالوت اور حطین کی طرح صدیوں یاد رکھا جائے گا۔

قرآن کریم میں سورۃ الاسراء کی آیات ۴ تا ۸ میں بتایا گیا ہے کہ بیت المقدس میں یہودی تین بار سرکشی کریں گے اور تینوں بار اللہ پاک ان کو سخت سزا دیں گے۔اب تک دو بار ہو چکا ہے (۵۸۷ قبل مسیح اور ۷۰ عیسوی) جبکہ ایک سرکشی ابھی باقی ہے۔اس سرکشی پر بھی ان کی پہلے کی طرح سرکوبی کی جائے گی۔شاید اس کا وقت آ گیا ہے۔آج پہلی بار دنیا بالخصوص ایشیا' افریقہ اور جنوبی امریکہ کے اکثر ممالک اسرائیل کے خلاف ہیں۔مغربی ممالک کے بہت سے باشندے اسرائیل کے خلاف کھڑے ہیں اور اپنی حکومتوں کے خلاف مظاہرے کر رہے ہیں۔ اپنی تاریخ میں آج پہلی دفعہ اسرائیل اکیلا کھڑا ہے۔اس کے جھوٹوں کا گھڑا پھوٹ چکا ہے۔

(تشکّر: ماہنامہ معارف' اعظم گڑھ' انڈیا۔اپریل ۲۰۲۴ء)

❁❁❁

قیامِ پاکستان کی بنیاد اور ہماری ذِمہ داریاں

ایک تصحیح — ایک وضاحت

''میثاق'' کے شمارہ اگست ۲۰۲۴ء میں جناب ممتاز ہاشمی کے مضمون ''قیامِ پاکستان کی بنیاد اور ہماری ذِمہ داریاں'' میں غلطی سے سورۃ الانفال کی آیت ۲۶ کی بجائے آیت ۲۷ کا متن درج ہو گیا تھا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری اس کوتاہی سے درگزر فرمائے۔ متعلقہ آیت مع ترجمہ درج ذیل ہے:

﴿ وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾

(الانفال)

''اور اس حالت کو یاد کرو جب کہ تم زمین میں قلیل تھے کمزور شمار کیے جاتے تھے، اس اندیشہ میں رہتے تھے کہ تم کو لوگ نوچ کھسوٹ نہ لیں، سو اللہ نے تم کو رہنے کی جگہ دی اور تم کو اپنی نصرت سے قوت دی اور تم کو بہترین پاکیزہ رزق عطا فرمایا تاکہ تم شکر کرو۔''

✿✿✿

اسی مضمون کے بارے میں ہمیں ممتاز مؤلف جناب رضی الدین سید کا مکتوب موصول ہوا ہے، جس میں موصوف نے علامہ محمد اسد کی شخصیت کے بارے میں مزید روشنی ڈالی ہے۔ قارئین کے استفادہ کی خاطر یہ مکتوب ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے۔

مدیر محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

میثاق شمارہ اگست میں شائع شدہ مضمون ''قیامِ پاکستان اور ہماری بنیادی ذمہ داریاں'' از جناب ممتاز ہاشمی میں علامہ محمد اسد کی شخصیت اور پاکستان سے متعلق ان کی خدمات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ مواد کو مزید مؤثر کرنے کی خاطر راقم ذیل میں چند نکات کا مزید اضافہ کرنا چاہتا ہے تاکہ اُن کی شخصیت اور اُس وقت تک کے قومی حالات بہتر طور پر قارئین کے سامنے آسکیں۔

یہ اضافہ جات راقم نے علامہ اسد کی اپنی کتاب "The Road to Makkah" سے بیشتر انہی کی زبانی پیش کیے ہیں۔ علامہ محمد اسد لکھتے ہیں:

''۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد مجھے ''محکمہ اسلامی تعمیرِ نو'' (Department of Islamic Reconstruction) کا سربراہ مقرر کیا گیا تاکہ ملک کے لیے ایک عملی اسلامی نظام سامنے لایا جاسکے۔

.....لیکن دو سال کی لگاتار محنت شاقہ (وفات قائداعظم' از مؤلف) کے بعد' حکومت پاکستان کی جانب سے میرا تبادلہ وزارتِ خارجہ میں کر دیا گیا جہاں سے مجھے نیویارک میں واقع اقوام متحدہ کے آفس میں کامل اختیارات کے ساتھ بطور سفیر تعینات کر دیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ ایک طرف مَیں مغربی ممالک سے پاکستان کے تعلقات کو مضبوط بناؤں اور دوسری جانب مسلم مملکتوں سے بھی روابط مضبوط کروں۔'' (واضح رہے کہ اس وقت وزیراعظم لیاقت علی خان تھے: مؤلف)

''یو این او کے مغربی سفیروں کو اگرچہ اسلام سے متعلق' دیگر پاکستانی مسلم سفراء بھی واقفیت دے سکتے تھے لیکن ایک مغربی مسلم فرد ہونے کے باعث جس تفصیلی اور مدلّل انداز سے مَیں انہیں اسلام کے بارے میں سمجھا سکتا تھا' وہ دوسرے پاکستانی کہاں کر سکتے تھے!.....(اُس دور میں) ملک میں کتنے لوگ آخر اس صلاحیت کے حامل تھے جو مغربی نمائندوں کو اس بہتر انداز سے دینِ اسلام کے بارے میں کما حقہ واقف کروا سکتے جس انداز سے اسلام قبول کردہ خود مَیں' مغربی فرد' انہی کی زبان میں کروا سکتا تھا؟ میری وضاحتیں بہتر انگریزی اور مناسب سفارتی زبان' دونوں انداز میں ان پر یقیناً ایک عمدہ اثر چھوڑتی تھیں..... مَیں جب بھی ان کے سامنے اسلام کی صفات سفارتی مثالوں کے ساتھ پیش کرتا تو وہ حیران رہ جاتے تھے۔ تمام مندوب تب گمان کرتے تھے کہ اقوام متحدہ میں پاکستان نے انہیں گویا خاص اسی مقصد کے لیے متعین کیا ہے.....''

''۱۹۵۲ء کے بعد میں نے یو این مشن اور وزارت خارجہ' دونوں ہی سے استعفا دے دیا اور مذکورہ کتاب The Road to Makkah لکھنے کے قصد میں ڈوب گیا۔''

(کتاب مذکورہ' صفحات بالترتیب ۱، ۲، ۸۔ شائع شدہ نیویارک ۱۹۵۴ء)

ان کے بارے میں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ قیام پاکستان سے قبل بھارت میں رہ کر انہوں

نے اپنے انگریزی رسالے میں ’’ہم پاکستان کیوں بنانا چاہتے ہیں؟‘‘ کے عنوان سے مضامین کا ایک سلسلہ بھی شدّ ومدّ سے شروع کیا تھا‘ جس کا لُبِّ لُباب یہی تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے یہ ملک ایک عملی تجربہ گاہ ثابت ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

’’مَیں ۱۹۲۶ء میں مسلمان ہوا تھا‘ جس کے بعد میری ملاقات لاہور میں فلسفی‘ شاعر اور پاکستان کے روحانی باپ‘ علامہ اقبال سے ہوئی۔ چنانچہ یہ علامہ اقبال ہی تھے جنہوں نے مجھے ہندوستان سے مزید آگے چین‘ مشرقی ترکستان اور انڈونیشیا وغیرہ کی جانب سفر سے منع کرتے ہوئے صرف ہندوستان ہی میں مقیم رہنے پر زور دیا تھا۔

.....اگرچہ تخلیق پاکستان اُس وقت تک محض ایک خواب تھا لیکن علامہ نے مجھے مستقبل کی اسلامی ریاست ہی میں رہ کر دانشورانہ رہنمائی کی ہدایت کی تھی...... چنانچہ انہی کے ایما پر مَیں نے ہندوستان میں اپنے کئی سال مطالعہ کرنے‘ لکھنے اور تقریریں کرنے میں گزارے۔ حتیٰ کہ تب لوگ مجھے اس موضوع پر ایک اہم شخصیت گردانںنے لگے تھے۔‘‘

(کتاب مذکورہ‘ صفحہ ۲)

واضح رہے کہ علامہ محمد اسد بنیادی طور پر آسٹریا کے یہودی تھے جو اپنے ملک کے ایک قومی اخبار سے منسلک تھے۔ ان کا اصل یہودی نام Leopold تھا۔ Leo کے معنی چونکہ اسد (شیر) کے ہوتے ہیں‘ اس لیے قبولِ اسلام کے بعد ان کا نام محمد اسد ہی رکھ دیا گیا تھا۔

رضی الدین سید‘ کراچی

ماھنامہ ’’میثاق‘‘ لاھور

داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے قرآنی فکر کا ترجمان‘ ایک علمی‘ دعوتی اور تربیتی رسالہ!

صرف آپ ہی کے زیرِ مطالعہ کیوں؟

وقت اورحالات کی اشد ضرورت ہے کہ اسے ایک مشن سمجھ کر واعظین و مربّیین‘ تعلیمی اداروں‘ لائبریریوں‘ مکتبہ جات اور ہر گھر و فرد اور خاص طور پر الاقرب فالاقرب کی بنیاد پر اپنے دوست‘ احباب اور اعزّہ واقرباء تک پہنچانے میں اپنا کردار ادا کریں۔

یہ آپ کے لیے صدقہ جاریہ ہوگا!

کیا ابتدائی دور کا انسان جنگلی تھا؟

رضی الدین سیّد☆

لادینی دانشوروں نے یہ بات زور شور سے پھیلائی ہے کہ ابتدائی انسان اپنے جسم ڈھانپنے کے لیے پتے استعمال کرتے تھے اور جنگلوں میں ٹھکانا بناتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اولین انسان حضرت آدم علیہ السلام زمین پر آنے سے پہلے جنت کی نعمتوں بھری دنیا میں رہا کرتے تھے۔ انہیں حریر و ریشم کے لباس اور سونے کے تاج پہنائے گئے ہوں گے اور کھانے کے لیے ہمہ قسم کے پھل اور پرندوں کے گوشت دیے جاتے رہے ہوں گے۔ قرآن حکیم میں جنت کی بعض نعمتوں کا ذکر بایں الفاظ ہوا ہے:

﴿وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُونَ ﴿٢٠﴾ وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ ﴿٢١﴾﴾ (الواقعة)

''اور پھل جو وہ پسند کریں' اور پرندوں کے گوشت جو انہیں مرغوب ہوں۔''

انہیں اگر اللہ تعالیٰ اپنا خلیفہ بنا کر زمین پر بھیجے گا تو کیا کھانے کو کچا گوشت' تن ڈھانپنے کو پتے اور رہنے کو جنگل فراہم کرے گا؟ اتنی بڑی ذمہ داری ان حالات کے ساتھ عطا کرے گا؟ کیا اس حوالے سے اللہ تعالیٰ بے فکر تھا؟ پھر تو وہ بہت ناانصاف ہوا کہ اپنے ہی مسجودِ ملائک بندے کے ساتھ ایسا ظلمِ عظیم کیا! حضرت آدمؑ اور اماں حواؑ دونوں بے چارے بارش' سردی اور گرمی میں جنگلوں' غاروں' درختوں پر رہتے تھے۔ موسمی حالات سے بچاؤ کے لیے موٹی کھال استعمال کرتے تھے' اور کچا گوشت کھاتے تھے۔ عام عقل میں یہ بات بھلا کہاں سماتی ہے؟ کیا کوئی انسان کبھی کچا گوشت بھی کھا سکتا ہے؟ یہ نہ تو اس کی فطرت میں ہے اور نہ اس کا جسم ہی اس انداز کا تشکیل دیا گیا ہے' خواہ وہ دنیا کا سب سے پہلا انسان ہی کیوں نہ ہو۔ بس ایک سبق ہے جو آج تک مسلسل رٹایا جا رہا ہے۔

☆ای میل: national.a.research@gmail.com

حضرت نوح علیہ السلام، جنہیں آدم ثانی کہا جاتا ہے، قرآن بتاتا ہے کہ ان کا گھر اتنا بڑا تھا کہ تمام پیروکار، تیس یا چالیس جو کچھ بھی ہوں، اسی گھر میں پناہ لیے ہوئے تھے۔ ﴿وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ﴾ (نوح: ۲۸)۔ حضرت نوح علیہ السلام کا دور آج سے لگ بھگ ۶۰۰۰ سال قبل کا تو ضرور ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس وقت تک انسان نے کافی ترقی کر لی تھی۔ یہ سب محض افسانے ہیں جو دہریوں اور خدا بیزار لوگوں نے ہم سب کے ذہن میں پیوستہ کر دیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفت تو یہ ہے کہ نیک و صالح بندوں کو وہ اپنی خاص الخاص حفاظت اور نعمتوں میں رکھتا ہے۔ آدم علیہ السلام تو بڑے مرتبے والے پیغمبر تھے۔ ایک اجنبی دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے اللہ تعالیٰ انہیں اپنی وحیٔ متواتر کے ذریعے بہت کچھ ہدایات بھی دیتا ہوگا، جو ان تک حضرت جبریل علیہ السلام ہی لاتے ہوں گے۔ جب اللہ تعالیٰ انہیں درخت کا پھل چکھنے کے بعد کا گناہ معاف کروانے کے لیے کلمات سکھا سکتا ہے تو اس نے انہیں کھانے پینے اور مکان بنانے کی تراکیب کیوں نہیں القا کی ہوں گی؟ یہ بات خلافِ عقل ہے کہ اس لق ودق دُنیا میں اللہ تعالیٰ اپنے خلیفہ خاص کو اتارے اور پھر ہدایت کے لیے فرشتے کو ایک بار بھی ان کے پاس نہ بھیجے!

لادین مفکّرین یہ حقیقت جان بوجھ کر بھلا دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب آسمان سے سب سے پہلے انسان کو اتارا تھا تو وہ محض مٹی کی ایک بے جان مورت نہیں تھا بلکہ ایک متحرک جسم و جان رکھتا تھا۔ اس کے ہاتھ اور پیر بھی مضبوط تھے اور وہ مشقت بھی خوب کر سکتا تھا۔ اسی کے ساتھ وہ عقل سلیم کا بھی مالک تھا۔ بے شک اُس دور کا انسان آج کے دور کی مانند سائنسی دماغ نہ رکھتا ہو گا لیکن ہر طرح کا فرق ملحوظ خاطر رکھنے کے باوجود وہ عقل سے بالکل عاری ہرگز نہ تھا۔ اسی باعث اسے جانور نہیں بلکہ انسان کہا گیا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ اگر انسان کے پاس عقل ہوگی تو وہ اسے استعمال بھی کرے گا، کیوں کہ عقل کی فطرت ہی یہ ہے کہ وہ اپنے اظہار کے لیے بے چین رہتی ہے۔ سو اگر اس پہلے انسان کے پاس عقل ہوگی تو اپنے رہن سہن کی خاطر وہ سوچ بچار بھی کرے گا، نت نئے راستے بھی کھولے گا، اور کوئی نیا راستہ بھی دریافت کرے گا۔

کسی چٹیل میدان میں ایک کچا سا مکان بنانے کے لیے آخر کون سی انجینئرنگ کی ڈگری درکار ہوتی ہے؟ گارے، روڑے اور پتھر کی چار دیواری، اوپر گھاس پھوس اور کھجیوں کی ایک

چھت ہی تو ڈالنی ہوتی ہے۔ یوں ایک گھر تیار ہو جاتا ہے۔ تھر کے علاقے میں چٹائیوں، سرکنڈوں، لکڑیوں اور گھاس پھونس سے بنی ہوئی مخصوص جھگیاں آج بھی بے شمار ملتی ہیں جہاں کے دیہاتی صدیوں سے آرام و سکون کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ بھلا کوئی سوچے کہ عقل رکھنے کے باوجود قدیم دور کا انسان آخر کیوں غاروں، بھٹوں اور جنگلوں میں جانوروں کی مانند رہائش رکھتا ہوگا! اللہ تعالیٰ نے آسمان سے کیا، عقل و خرد سے بالکل آزاد، جنگلی، وحشی اور احمق انسان بھیجے تھے؟ معاذ اللہ! چلانی تو اسے تھی وسیع و عریض دنیا، کام اس نے انسان کو دیا تھا کٹھن ترین مگر مال اتارا تھا اس نے حد درجہ تھرڈ کلاس؟ کون سی عقل بھلا اس مفروضے کو تسلیم کر سکتی ہے؟ دنیا میں کوئی ادارہ اگر کسی دوسرے شہر میں اپنی نمائندگی کے لیے کسی کو روانہ کرے گا تو وہ ایک قابل ترین فرد ہی کو بھیجے گا۔ یہ ایک بالکل فطری و عقلی بات ہے۔ عجیب بات ہے کہ دنیا چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ جب کسی کو یہاں بھیجے گا تو ڈھونڈ ڈھونڈ کے ردی و بے کار مال ہی اتارے گا! کیا وہ علیم و خبیر نہیں ہے؟

ایک اور صفت جس سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو بالکل اس کی ابتدا ہی میں نوازا تھا، وہ اس کے زبانی اظہار کی صلاحیت تھی۔ انسان اپنے آغاز سے آج تک بولتا ہی رہا ہے، اسی لیے اسے حیوانِ ناطق بھی کہا جاتا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے سورۃ الرحمٰن کے آغاز ہی میں بتایا ہے کہ ﴿خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝﴾ یعنی خدائے رحمٰن نے انسان کو پیدا کیا اور اسے بیان کرنے کی صلاحیت دی۔ یہ آیت خاص نبی آخر الزمان ﷺ کے لیے نہیں اُتری بلکہ اس میں لفظ ''انسان'' انفرادی طور پر استعمال ہوا ہے۔ لہٰذا صرف اسی ایک خصوصیت کے ساتھ ہی انسان اپنی بہت ساری مشکلات حل کرنے کے قابل ہوتا ہے۔

انسان پر اللہ تعالیٰ نے ابتدا ہی سے لباس کا احساس بھی نازل کیا تھا:

﴿يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ﴾ (الاعراف:۲۶)

''اے آدم کی اولاد! ہم نے تم پر لباس اتارا جو تمہاری شرم گاہوں کو ڈھانپتا ہے اور آرائش و زیبائش کا سبب بھی ہے۔''

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر لباس پہننے کے فطری احساس کو الہام کیا ہے۔ اس کے جسم کو چونکہ گھنے بال نہیں دیے گئے، اس لیے متبادل کے طور پر اسے لباس کی

ضرورت ودیعت کی گئی ہے۔اس کی وجہ سے اول تو وہ شرم وحیا کے تقاضے پورے کرے گا اور دوم موسم کی شدت سے بھی خود کو محفوظ رکھے گا۔اللہ تعالیٰ نے لباس اور لوہا بالکل ابتدا ہی میں اُتار دیا تھا جو ظاہر ہے کہ انسانوں کے استعمال ہی کے لیے تھا۔

یہ سوال تحقیق طلب ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے حضرات آدم وحوا کو جنت سے زمین پر بالکل برہنہ اتارا تھا؟ کیا یہ اس کی شانِ شہنشاہی سے مطابقت رکھتا ہے؟ سو اس کے بعد یہ سوال کہاں سے پیدا ہوتا ہے کہ اسے لباس کے بارے میں کچھ بھی پتہ نہ تھا۔حد تو یہ ہے کہ خود تورات میں بھی انہیں زمین پر عریاں حالت میں اتارنے کا ذکر نہیں ہے۔کتاب تورات پیدائش کے مطابق:

''خداوند خدا نے حیوان کے چمڑے سے پوشاک بنا کر آدم کو اور اس کی بیوی کو پہنایا۔''
(پیدائش۔ ۳:۲۱)

ایک نہ بھولنے والی حقیقت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ایک خصوصی صفت الگ سے بھی عطا کی تھی' اور وہ تھی علم کی۔اللہ تعالیٰ نے فرشتوں پر واضح کر دیا تھا کہ آدمؑ کو ہم نے ہر قسم کے علم سے مزیّن کیا ہے۔یہ ایک ایسی صفت ہے جو دنیا کے پہلے انسان کو ہر قسم کے معاملات وحالات کے سلجھاؤ میں یقیناً مدد دیتی ہوگی۔

ایک صحت مند جسم' متحرک ہاتھ پاؤں' عقلِ سلیم' علمِ اشیاء' علمِ اسماء' اور ایک صاف سیدھی راہ! اس پر مزید یہ کہ الہامی ہدایات بھی' یعنی غلط اور صحیح کے فرق کی درست شناخت کی حس۔اس کے بعد پہلا انسان بھلا کہاں سے ٹھوکر کھائے گا؟ کیوں درختوں کے پتے چبائے گا؟ کیوں جانور کی کھالوں سے تن ڈھانکے گا؟ کیسے وقت گزاری کرے گا؟ کس لیے غاروں میں جا کر سویا کرے گا؟ پھر دو تین نسلوں بعد تو عقل وذہن از خود مزید ترقی کرتے ہیں۔اگر بالفرض وہ کھال بھی پہنے گا تو اس مقصد کی خاطر اسے کوئی جانور ذبح کرنا پڑے گا جس کے لیے چھرے اور بغدے کی ضرورت پڑے گی۔چنانچہ نت نئے مسائل اُبھرتے ہیں تو نت نئے حل بھی دریافت ہوتے ہیں۔چند عشروں کے بعد کا انسان' اپنے پہلے والے انسان سے کہیں زیادہ معتبر' کہیں زیادہ عاقل اور کہیں زیادہ مہذب بنتا جاتا ہے۔ہر اگلے دور میں' انسان سہولتوں اور تعمیرات و ترقیات کے حوالے سے نت نئی جدتیں پیدا کر کے سہولتوں پر سہولتیں حاصل کرتا چلا گیا ہوگا۔

ایک اور حقیقت یہ بھی ہے کہ زمین پر اتارے جانے سے قبل اللہ تعالیٰ نے حضرت

آدم علیہ السلام کو ایک پاکیزہ بیوی بھی عطا کی تھی' جو نسلِ انسانی کی افزائش کے ساتھ آپؑ کی مشکلات میں بھی دم ساز و ہم راز بنی رہی تھیں۔ ان کا ایک مکمل خاندان تھا' اور وہ باہمی گفتگو کی خاطر کوئی زبان بھی استعمال کرتے ہوں گے!

دنیا کی پہلی کشتی حضرت نوح علیہ السلام سے منسوب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ کشتی ﴿ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ﴿۱۳﴾﴾ (القمر) ''تختوں اور کیلوں والی'' تھی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو اس کشتی کا ڈیزائین کس نے سمجھایا تھا جو نہ صرف پانی میں نہیں ڈوبے بلکہ سینکڑوں انسانوں اور جانوروں کو بھی لے کر بحفاظت طویل سفر کرے؟ یہ سارے مراحل اللہ تعالیٰ کی وحی کی روشنی ہی میں تکمیل تک پہنچ رہے تھے' حالانکہ اس کی تفصیل کہیں موجود بھی نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو بھی اللہ تعالیٰ نے پُرسکون اور محفوظ زندگی گزارنے کے تمام طریقے وحی کے ذریعے ہی سمجھائے ہوں گے اگرچہ اس کی بھی کوئی تفصیل کتابوں میں نہیں ملتی۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب ملکہ بلقیس کو اپنے محل میں دعوت دی تھی تو محل کا فرش اس قدر شفاف و شیشے کی مانند تیار کروایا تھا کہ خود ملکہ بھی اس سے دھوکا کھا گئی تھی۔ پھر لوہا تھا جس کا استعمال بھی ازمنۂ قدیم میں حضرت داؤد علیہ السلام کے دور سے شروع ہو چکا تھا۔ سیسے کی دھات حضرت ذوالقرنین کے دور سے بھی قبل زیرِ استعمال تھی۔ سیسے کی بے حد پختہ و اونچی دیوار جو حضرت ذوالقرنین نے کسی قوم کے لیے تعمیر کی تھی' وہ بھی تین چار ہزار سال پہلے کی ذہانت' عقل' اور آرٹ کا لاجواب نمونہ تھی۔ وہ دیوار (سَد) تو تا حال موجود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان ان دھاتوں اور ان سے متعلق ہنر کا استعمال ماقبلِ تاریخ بھی اپنی انتہا تک سیکھ چکا تھا۔ پھر کیسے کوئی جاہل و متعصب دانش وراس صدی میں بیٹھ کر یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ ابتدائی دور کا انسان بدتہذیب اور زندگی گزارنے کے احسن طریقے سے قطعی طور پر لاعلم تھا؟ عقل ان مفکرین کے جعلی مفروضوں کی تائید کرنے سے قاصر ہے؟ ہمارے پاس تو الحمدللہ' قدیم ترین دورِ تہذیب و تمدن تک کے باقاعدہ ثبوت اور حوالے موجود ہیں۔

حضرت آدم و حضرت شیث علیہما السلام کی دنیا کے بالکل ابتدائی دور کے لوگ آخر سروں کے بال بھی تو کٹواتے ہوں گے۔ پیروں تک پہنچے ہوئے بال بھلا کوئی کہاں تک سہار سکتا ہے؟ ایسے میں زندگی مشکل ہو جاتی اور نقل و حرکت ممکن نہیں رہتی۔ تو وہ کون سا آلہ یا اوزار' یا ہتھیار تھا جس کی

مدد سے وہ اپنے لمبے لمبے بال چھوٹے کروایا کرتے تھے؟ صاف ظاہر ہے کہ اپنے دور تک کی ضرورت کے تمام آلات و اوزار ’’غاروں میں رہتے اور جانور کی کھالوں سے جسم ڈھانکنے والوں‘‘ نے دریافت کر ہی لیے تھے۔ اسی سے اس دور کے انسان میں عقل و ذہن کی موجودگی کا واضح پتہ ملتا ہے۔

یہ فلسفہ بھی زور شور کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے اور ساتھ میں فرضی تصویریں بھی دکھائی جاتی ہیں کہ شروع شروع میں انسان اپنے چاروں ہاتھوں کے ساتھ چلتا تھا اور اس کے جسم پر جانوروں کی مانند گھنے بال بھی تھے۔ پھر ماحول سے مطابقت رکھنے کی خاطر ہر سو، دو سو سال بعد وہ کھڑا ہونے کے قابل ہوا۔ پہلے وہ کچھ جھک کر چلا اور بعد ازاں مزید سیدھا ہوا۔ تا آنکہ چھ سات سو سال بعد وہ بالکل سیدھا کھڑا ہو گیا اور اس کے گھنے بال بھی ختم ہو گئے۔ ہم بتانا چاہتے ہیں کہ کوئی بھی انسان سو، دو سو سال تک مسلسل جھک کر نہیں چل سکتا۔ یہ ناممکن ہے۔ فرضی تصویروں کا مطلب ہی یہ ہے کہ ان سے اپنے لیے دلیلیں حاصل کی گئی ہیں۔ یہ سب کی سب کہانیاں ہیں۔

سوالات پر سوالات ہیں جن کے معقول جوابات کے لیے لادین دانشور، ہونٹوں کو سیے بیٹھے ہیں۔ ایک شغل چھیڑ دیتے ہیں اور دنیا کو اس کی بھول بھلیوں میں گم کر دیتے ہیں۔ پھر جب ان کے آگے عقل و دانش کے سوالات رکھے جائیں تو منہ میں گھنگنیاں ڈال کر بیٹھ جاتے ہیں۔

مغربی فاضلین حضرت آدم علیہ السلام کو بے شک جو چاہے کہتے رہیں، انہیں اللہ کا پیغمبر تسلیم نہ کریں، بلکہ انسان ہی تسلیم نہ کریں، مگر ہم انہیں دنیا کے شریف ترین، مہذّب ترین، صاحبِ علم، مسجودِ ملائک، اشرف المخلوقات، خالق کے پیغام کے داعی، اور اپنی اہلیہ کے ساتھ دنیا کو آباد کرنے والے کامیاب معمار کے طور پر تسلیم کرتے ہیں جن کے بعد دنیا نے ایک لاکھ سے زائد افضل ترین انبیاء اور کروڑوں صالح ترین شخصیات کو پایا ہے۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ عقل کی باتوں کو بنیاد بنانے والے سائنس دان، فخر سے خود ہی غیر سائنسی دعوے کرتے ہیں اور ذرا نہیں شرماتے!

داعیٔ رجوع الی القرآن بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القُرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

اب دو انداز سے دستیاب ہے

- خوبصورت ٹائٹل
- سفید کاغذ
- معیاری طباعت

1 2935 صفحات پر مشتمل، سات جلدوں میں

(الگ الگ جلدیں بھی دستیاب ہیں!)

مکمل سیٹ کی قیمت: 6000 روپے

2 متعدد اضافی خوبیوں کا حامل، طبع جدید

- قرآنی رسم الخط
- تفسیری سائز
- عمدہ سفید کاغذ
- مضبوط مراکو جلد

2560 صفحات پر مشتمل، چار جلدوں میں

مکمل سیٹ کی قیمت: 9600 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

Oct. 2024
Vol.73

Regd. CPL No.115
No.10

Monthly **Meesaq** Lahore